اردو کا پہلا آن لائن ادبی جریدہ

سَمت

شمارہ ۵۷، جنوری تا مارچ ۲۰۲۳ء

مدیر
اعجاز عبید

اداریہ
مجھے کہنا ہے کچھ ----

نئے سال کا پہلا شمارہ حاضر ہے، لیکن اس شمارے کے بارے میں بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔
پہلی بات یاد رفتگاں کے سلسلے میں، جن دو ادیبوں کو شمارے میں یاد کیا گیا ہے، ان سے میری ذاتی یادیں وابستہ ہیں۔
منیب الرحمان صاحب علی گڑھ میں ہمارے پڑوسی تھے۔ ۱۹۶۹۔۷۰ء میں ہم لوگ منیب صاحب کی کوٹھی گلِ رعنا سے ملحق کوٹھی قیصر لاج کے ایک حصے میں بطور کرایہ دار رہتے تھے۔ اور ہمارے سامنے ہی منیب صاحب نے علی گڑھ چھوڑ کر امریکہ بسایا۔ اور ہم نے قیصر لاج چھوڑ کر بیگم منزل میں اپنا گھر بسایا۔ ان کی بیگم الزبتھ رحمان میری استانی بھی تھیں کہ میں نے بی ایس سی سیکنڈ ائر میں فرانسیسی زبان کا سرٹفکیٹ کورس لے رکھا تھا (اطلاعاً عرض ہے کہ میرا علی گڑھ میں بی ایس سی آنرس (جیالوجی) کا دورانیہ ۱۹۶۸ تا ۱۹۷۱ اور ایم ایس سی جیالوجی کا ۱۹۷۱ تا ۱۹۷۳ تھا)۔ اس جوڑے سے تعلقات مگر صرف اس حد تک تھے کہ میں انہیں سلام کرتا تھا اور وہ جواب دے دیتے تھے۔ الزبتھ رحمان اپنے پسندیدہ طلبا میں میرا شمار کرتی تھیں۔ اس زمانے میں یونیورسٹی میں سبھی ان کو الزبیتھ ہی کہتے تھے، زیبا نام کا یہی سنا تھا کہ صرف منیب صاحب پکارتے ہیں۔ اور منیب صاحب سے یہ بھی تعلق تھا کہ یونیورسٹی کے مشاعروں میں وہ بھی شریک ہوتے تھے اور اکثر مشاعروں میں ابتدا مجھی سے ہوتی تھی، اور جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، جذبی صاحب اور منیب صاحب پر ہی یہ مشاعرے ختم ہوتے تھے۔ کبھی سرور صاحب، جو صدرِ شعبہ تھے، انہیں مجبور کر دیا جاتا کہ آخر میں وہ کلام سنائیں۔
دوسری ہستی برقی صاحب کی تھی۔ جو مجھے پابندی سے اپنی تخلیقات اور شاعری، اکثر سجا سنوار کر تصویری شکل میں واٹس ایپ پر بھیجتے تھے۔ لیکن یہ تو حالیہ سالوں کی بات ہے جب سے کہ سمارٹ فون اور واٹس ایپ نے مواصلات کی کایا پلٹ دی ہے۔ پہلے پہل تو صرف ای میل سے بھیجتے تھے۔ ان سے پہلی بالمشافہ ملاقات بھی اس وقت ہوئی جب میں دفتر کے کام سے، بلکہ دفتر کے خلاف ایک مقدمے میں، جس کی نوعیت دیوانی یا فوجداری نہیں، بلکہ یہ حقِ اطلاع (Right to Information) کا معاملہ تھا، پیشی کے لئے دہلی گیا تھا۔ برقی صاحب سے فون پر بات ہوئی تھی اور میں نے یہ اطلاع دے دی تھی کہ میں فلاں تاریخ کو دہلی میں ہوں اور حکومتِ ہند کے انفارمیشن کمیشن میں مجھے اس دن صبح جانا ہے۔ برقی صاحب وہیں سوچنا بھون پہنچ گئے تھے۔ اور یہی نہیں بلکہ (کیونکہ مجھے پیشی میں کافی بعد میں وقت دیا گیا تھا) کچھ مسائل کے حل بھی انہوں نے مجھ سے پوچھے تھے اور میرے پاس اس وقت لیپ ٹاپ بھی تھا، تو میں نے وہیں ایک کمرے میں بیٹھ کر ان کے کمپیوٹر بلکہ اردو یونی کوڈ کے مسائل بھی حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ شاید آکاش وانی بھون، اپنے دفتر، سے ہی سوچنا بھون آ گئے تھے) اور تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے تک میرے ساتھ رہے۔ بس یہی ان سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد محض فون پر باتیں ہوتی رہیں۔
مجھے افسوس ہے کہ میں نے ان کی تخلیقات کو سَمت کے لئے معیاری نہیں گردانا اور شائع نہیں کیا۔ انہیں مشورہ دیتا رہا کہ کسی اچھے عروض داں سے ربط کیا کریں کہ اَدَبی کو اَدبی باندھنا اور ایسی ہی کچھ تلفظ کی اغلاط، اور ع، ہ، ح وغیرہ کو الف

کی طرح وصل کر دینا عروضی اغلاط سے بچ سکیں۔ [اعجاز عبید اور سردار علی کو انہوں نے ہمیشہ مفعول فا (ع) باندھا ہے، اور جب جب سَمت کے نئے شمارے کی اطلاع فیس بک پر دی، کمنٹ میں ان کا ایک عدد قطعہ وصول ہوتا تھا] مگر پھر بھی انہوں نے کوئی شکایت نہیں کی۔ ان کی اہمیت بطور موضوعاتی شاعر کے ضرور تھی، اس لئے میں نے ان کا بھی گوشہ مختص کرنا ضروری گردانا (مگر ان کی موضوعاتی شاعری کی جگہ ان کی غزلیں ہی اس گوشے میں شامل ہیں۔)

اب تیسری بات۔ اس بار میں اپنے ہی ایک نا مکمل ناول کا پہلا باب بطور افسانہ شامل کر رہا ہوں۔ یہ پچھلے دنوں پرانے کاغذات اور فائلوں میں برامد ہوا۔ اس کا پیش منظر یہ ہے کہ ایم ایس سی کے بعد ۱۹۷۴۔۷۵ء میں کافی فرصت میسر آئی تھی اور ان دنوں مرحوم دوست شارق ادیب (بعد میں مظفر علی سید) کی صحبت میں بہت افسانے لکھے تھے۔ ان دنوں شارق ادبی نشستیں بھی برپا کیا کرتے تھے جس میں سید محمد اشرف، فرحت احساس اور آشفتہ چنگیزی شریک ہوتے تھے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب اشرف نے لکڑ بگھے کو ہنسانا اور رلانا شروع کیا تھا۔ یہ ناول 'چھوٹی حویلی' بطور خاص قاضی عبد الستار کے سٹائل میں اور انہیں کے پسندیدہ موضوع پر لکھنا شروع کیا تھا۔ سوچا تھا کہ ان کو دکھایا جائے گا لیکن مکمل ہونے کے بعد، اور جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، شارق نے بھی اس کا کچھ حصہ ہی پڑھا تھا۔ اور پھر نومبر ۱۹۷۵ء میں مَیں نے علی گڑھ کو خیر باد ہی کہہ دیا۔ بہر حال اب یہ مسودہ مل گیا ہے تو سوچا کہ اسے خود ہی کمپوز کر کے محفوظ کر دوں۔ احباب کی رائے کا انتظار رہے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ میری یہ خواہش بھی ہے کہ اب اور کوئی دوست اسے مکمل ناول کی شکل دے دے۔ کیا میری امید کوئی پوری کرے گا؟

'چھوٹی حویلی' پر ہی نہیں، مکمل شمارے پر آپ کی آرا کے لئے منتظر ہوں۔

ا۔ ع۔

عقیدت

نعت ـــ محمد عادل فراز

سر پہ سایۂ رحمت آسرا محمدؐ کا
بھا گیا ہے نظروں کو راستہ محمدؐ کا

عرش پر قدم ان کے کرسی و قلم ان کے
کہکشانِ عالم ہے نقش پا محمدؐ کا

دل کے صحنِ خانہ سے خوشبوئیں سی آتی ہیں
جب زبان کرتی ہے تذکرہ محمدؐ کا

ذکر خود محمدؐ کا کر رہا ہے خالق بھی
تذکرہ ہے عالم میں جا بجا محمدؐ کا

ٹھوکروں میں رکھتا ہے مال و زر زمانہ کے
عاشق نبیؐ ہے جو آشنا محمدؐ کا

سب سے پہلے احمدؐ ہیں کل کے کل محمدؐ ہیں
آج تک ہے بس قائم سلسلہ محمدؐ کا

***

گاہے گاہے باز خواں
دوسرا گناہ --- انتظار حسین

اس دن الیملک دستر خوان سے بھوکا اٹھا، اس نے زمران کے سامنے رکھی ہوئی روٹی پر نظر کی، پھر دسترخوان پر چنی ہوئی روٹیوں کو اور لوگوں کو دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا اور یہ وہ لوگ تھے جو دور کی زمین سے چل کر یہاں پہنچے تھے، ان کی زمین ان پر تنگ ہو گئی تھی، انہوں نے اپنے معبدوں اور مقبروں اور حویلیوں کی طرف پشت کی اور کہا کہ بے شک اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔ پہلے ایک گھرانا آیا اور یہاں پہنچ کر کھلے آسمان میں سخت زمین پر پڑا رہا، پھر دوسرا گھرانا آیا اور زمین کی سختی سے لڑنے لگا، پھر گھرانے آتے چلے گئے اور اونچے درختوں کو سرنگوں کرنے اور سخت زمین کو نرم بنانے پر جت گئے۔
جب وہ سب اکھٹے ہو گئے تو انہوں نے حشّام سے کہا کہ اے حشّام تو ہم میں بڑا ہے، پس تو ہمارے بیچ بیٹھ اور منصفی کر۔ حشام ان کے بیچ بیٹھا اور خوب منصفی کی۔ اس نے تا عمر ٹاٹ پہنا اور سب کے ساتھ ایک دستر خوان پر بیٹھ کر موٹی روٹی کھائی اور مٹی کے پیالے میں پانی پیا، اس نے ایک سو پچھتر برس کی عمر پائی اور جب وہ مرا تو اس کی کمر سیدھی تھی۔
حشّام کو یاد کر کے لوگ بہت روئے، پھر انہوں نے اس کی پہلی جورو کے پہلوٹھی کے بیٹے زمران کو اپنے بیچ بٹھایا اور کہا کہ اب تو اپنے باپ کی جگہ ہمارے درمیان منصفی کر۔
اس باپ کے بیٹے نے بھی خوب منصفی کی، پھر ایک دن یوں ہوا کہ ابی ملک نے دستر خوان پر بیٹھے ہوئے زمران کے آگے رکھی ہوئی روٹی پر نظر کی اور اس کے اجلے پن کو دیکھ کر حیران ہوا، پھر اس نے دوسروں کے سامنے رکھی ہوئی روٹیوں کو دیکھا کہ اتنی اجلی نہ تھیں۔ پھر وہ زمران سے مخاطب ہو کر بولا کہ اے حشّام کے بیٹے! کیا تو اب چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھائے گا، اور میں نے تیرے باپ سے اور تیرے باپ نے اپنے باپ سے یہ سنا ہے کہ جب گیہوں کی مینگ گیہوں کے چھلکے سے جدا ہو جائے تو گوشت ناخن سے جدا ہوتا ہے۔ اور گیہوں تھوڑا اور بھوک زیادہ ہو جاتی ہے اور ہمیں ہمارا پالنے والا اس دن پناہ میں رکھے کہ ہمارے درمیان گیہوں تھوڑا رہ جائے اور ہماری بھوک بڑھ جائے۔
اس دن الیملک دستر خوان سے بھوکا اٹھا، اور جب وہ دستر خوان سے بھوکا اٹھا تو بستی میں اس کا چرچا بہت ہوا، لوگ پہلے حیران ہوئے اور انہوں نے سرگوشیاں کیں کہ الیملک دسترخوان سے نوالہ توڑے بغیر اٹھ گیا اور اس نے زمران سے اپنی روٹی الگ کر لی، پھر وہ ڈرے کہ کیا سچ مچ گیہوں اپنے چھلکے سے جدا ہو گیا ہے۔ زمران نے لوگوں کو دیکھا اور غصّہ کیا اور جس جس نے حیرانی ظاہر کی اور خوف کا اعلان کیا اس کا دستر خوان اپنے دستر خوان سے الگ کر دیا۔ سو جہاں ایک دستر خوان تھا وہاں بہت سے دستر خوان ہو گئے، پر زمران کا دسترخوان مختصر ہو جانے پر بھی پھیلا ہوا رہا۔ اس کے آڑی اور حواری دونوں وقت اس کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھتے اور چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھاتے۔
زمران کے دستر خوان کے لیے آٹا باریک پیسا جاتا تھا اور ایک بڑی سی چھلنی میں چھانا جاتا تھا اور زمران نے چھنے ہوئے آٹے کی بھوسی کو دیکھ کر تشویش کی، زمران نہیں چاہتا تھا کہ لوگوں کے درمیان گیہوں تھوڑا رہ جائے اور ان کی بھوک بڑھ جائے تو اس نے یوں کیا کہ بچی ہوئی بھوسی کو لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ پس جنہیں آٹا کم ملا انہیں بھوسی زیادہ مل گئی، انہوں نے اپنے اپنے بے چھنے آٹے میں بھوسی ملا کر موٹی روٹی پکائی اور سیر ہو کر کھائی اور زمران کے آٹے سے جتنی بھوسی نکلتی تھی لوگوں میں تقسیم ہو جاتی تھی اور ان کے بے چھنے آٹے میں مل جاتی تھی۔ تو یوں زمران کے دستر خوان کی روٹی کی رنگت اور ہو گئی اور خلقت کی روٹی کی رنگت اور ہو گئی۔
زمران کا آٹا پہلے چھلنی میں چھانا گیا مگر پھر زمران کو احساس ہوا کہ آٹا چھلنی میں موٹا چھنتا ہے، اس نے باریک چھنائی کی ترکیب یہ نکالی کہ بہت باریک کپڑا بنوایا اور اس میں چھنے ہوئے آٹے کو مزید چھنوایا، حتیٰ کہ آٹا میدہ بن گیا اور روٹی زیادہ چٹی اور زیادہ ملائم ہو گئی، اس حساب سے بھوسی زیادہ بچی اور زیادہ لوگوں میں تقسیم ہوئی۔ اور زیادہ چھان کے آٹے میں آمیز ہوتی اور زمران کی روٹی کی رنگت اور لوگوں کی روٹی کی رنگت میں زیادہ فرق آ گیا۔
زمران نے باریک کپڑا آٹا چھنوانے کے لیے بنوایا تھا، مگر پھر یوں ہوا کہ وہ کپڑا اسے اپنی پوشاک کے لیے بھا گیا اور سدا سے موٹے ناج کی سنگت موٹے کپڑے سے اور باریک ناج کی سنگت باریک کپڑے سے چلی آتی ہے، تو زمران نے ٹاٹ اتار کر باریک کپڑا خود بھی پہنا اور اپنی بیٹی رافہ کو بھی پہنایا اور رافہ اس ماں کی جنی تھی جس نے عمر بھر ٹاٹ اوڑھا اور چکّی چلائی، وہ ایک وقت میں ایک من آٹا پیس کر اٹھتی تھی اور بستی کے بڑے من والے کنوئیں پر جا کر سو ڈول پانی کے کھینچتی تھی۔ بدن اس کا تانبے کی طرح تمتماتا تھا، اس تانبا بدن سے زمران بڑے کنوئیں کی من پر ٹکرایا اور گھاس کے گرم بستر پر اس کے سنگ بستر میں گیا، پھر وہ اپنی کھیتی اپنے گھر لایا، نو مہینے دس دن بعد اس نے بیٹی جنی کہ نام اس کا رافہ رکھا گیا اور وہ گرم لہو تانبا بدن والی عورت ایک سو پچاسویں برس میں اپنی تنی ہوئی کھال اور کسی ہوئی کچوں کے ساتھ اللہ

کو پیاری ہو گئی۔
الیملک کے بیٹے بختاور کی بھی رافہ سے مڈ بھیڑ بڑے کنویں کی من پر ہوئی تھی اور رافہ گندم کے خوشے کی مانند شاداب اور میدے کی لوئی کی مثال نرم اور چٹی تھی۔ گات خوب اور خوش نما اور سینہ جیسے گھی دودھ میں گوندھے میدے کے دو پیڑے، تو بختاور نے بڑے کنویں سے اسے تاکا اور پانی سے چھلکتے ڈول کی طرح اسے کھینچا اور سیراب ہوا، مگر پھر ایسا ہوا کہ وہ کنوئیں پر گیا اور اس نے رافہ کو وہاں نہ پایا، تب وہ رافہ کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا اس کے گھر تک گیا اور وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ رافہ کے گھر کی ڈیوڑھی اونچی ہو گئی ہے اور اس میں دروازہ لگ گیا ہے۔ اور اس بستی میں یہ پہلی ڈیوڑھی تھی جو اونچی ہوئی اور پہلا دروازہ تھا جو تعمیر ہوا۔
بختاور نے اس دروازے کو کھٹکھٹایا پر وہ دروازہ نہ کھلا۔ بختاور نے رافہ کو پکارا پر دروازہ بند رہا اور پکار کا جواب نہ آیا اور بختاور نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا اور پھر رافہ کو پکارا کہ اے عورت تو جو آرام میں ہے بے آرام کی سن اور دروازے سے باہر آ۔ اس سے پہلے کہ انگوروں کا موسم گزر جائے اور ہم پھل سمیٹنے سے رہ جائیں، اس سے پہلے کہ گندم کی بالیں سوکھ کر مرنڈ ہو جائیں اور ہم فصل کاٹنے سے رہ جائیں۔ بختاور نے رافہ کا دروازہ بہت کھٹکھٹایا اور رافہ کو بہت پکارا پر وہ دروازہ نہ کھلا۔ اس پکار کا جواب نہ آیا، تب وہ مایوس گھر لوٹا، اور درد سے کہا کہ میری کھیتی مجھ سے دور ہو گئی اور گوشت ناخن سے جدا ہو گیا۔
الیملک نے بختاور کے اندوہ کو دیکھا اور کہا کہ اے میرے بیٹے میں تجھ سے وہ کہتا ہوں جو میرے باپ نے مجھ سے کہا، اور میرے باپ نے مجھ سے وہ کہا جو اس کے باپ نے اس سے کہا، جو جن میں سے ہے وہ ان کے ساتھ اٹھایا جائے گا، اور جو عورت جس خمیر سے اٹھتی ہے اس خمیر میں واپس جائے گی۔ بختاور نے اس قول کو نہ مانا اور کرب سے کہا کہ میں رافہ سے ایسے الگ ہوا جیسے گندم کے دانے سے گندم کا چھلکا ہوتا ہے۔ تب الیملک نے اس سے کہا کہ اے مرے بیٹے اب میں تجھ سے وہ کہتا ہوں جو سلیمان حکیم نے اپنے فرزند سے کہا کہ شکیل عورت اگر پہچان نہ رکھتی ہو تو سور کے نتھنوں میں پڑی ہوئی سونے کی نتھ ہے۔
پھر بیٹے نے اپنے باپ سے کہا عشق موت کی مانند زور آور ہے اور گھر سے نکل گیا۔ بختاور گھر سے نکل کر رافہ کے دروازے پر گیا، پھر اسے بند پا کر اس نے چکر کاٹا اور گھر کے عقب میں گیا، پر وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اب رافہ کے گھر کی دیوار اونچی ہو گئی ہے، اور اس نے اندوہ سے کہا کہ واویلا ہو گندم کے دانے پر جو میرے اور رافہ کے درمیان دیوار بن گیا۔
اور یوں ہوا کہ جب زمران کے گھر کا دروازہ بن گیا اور اس میں کنڈی لگ گئی تو کچھ دیکھنے والوں نے اسے دیکھ کر رعب کھایا اور کچھ دیکھنے والوں نے اسے دیکھ کر اس کے پیچھے کی چیزوں کے بارے میں تجسّس کیا، پھر ایک دن یوں ہوا کہ زمران کی کی بھاری پوشاک چوری ہو گئی۔ اور یہ پہلی چوری تھی کہ اس بستی میں ہوئی، پہلے یوں تھا کہ سونے کی ڈلی بازار میں پھینک جاؤ اور دوسرے دن آ کر اٹھا لو۔ پھر یوں ہوا کہ لوگوں نے اپنی اپنی چیزیں سنگھوا کر رکھنی شروع کیں اور ایک آڑی نے زمران کی پوشاک چوری ہو جانے کے بعد زمران سے کہا کہ مرا گھر غیر محفوظ ہے۔ کیا میں دروازہ بنا لوں، زمران نے کہا، بنوا لے، اور اس نے دروازہ بنوا لیا، پھر دوسرے آڑی نے اجازت لی اور دروازہ بنوا لیا، پھر تیسرے آڑی نے اجازت لی اور دروازہ بنوا لیا اور پھر بستی میں دروازے بنتے چلے گئے۔ زمران نے اپنی پوشاک کی چوری کے بعد اپنی دیواریں اونچی کر لیں، پھر جب اس کے آڑیوں نے دروازے بنوائے تو انہوں نے بھی اپنی اپنی دیواریں اونچی کیں۔ ان کی اونچی دیواروں کو دیکھ کر زمران نے اپنی دیواروں کو اونچا کر لیا، جاننا چاہئے کہ پیڑ کی بڑھوتری کی ایک حد ہے پر دیوار کے اونچا ہونے کی کوئی حد نہیں ہے۔
زمران نے پہلے اپنی ڈیوڑھی اونچی کی اور دروازہ بنوایا، پھر اس نے اپنی دیواریں اونچی کیں اور دروازے کو مضبوط کیا، پھر اس نے دروازے پر نگہبان بٹھائے، پھر اس نے سواری بنوائی کہ دروازے سے نکل کر اس میں بیٹھتا اور باہر جاتا، پھر اس نے سواری کے لیے شاہراہ بنوائی کہ بستی کے گردا گرد پھیل گئی اور زمران کی دودھیا گھوڑیوں سے جتی ہوئی سواری اس پر ہوا کی مثال چلتی۔ پر الیملک نے زمران سے یہ کہا کہ میں نے تیرے باپ سے اور تیرے باپ نے اپنے باپ سے یہ سنا کہ جب سواری آ جاتی ہے تو مردوں کی ٹانگوں کا زور گھٹ جاتا ہے اور جب شاہراہ بن جاتی ہے تو زمین تنگ ہو جاتی ہے اور فاصلے دراز ہو جاتے ہیں۔
جب دروازے بن گئے اور دیواریں اونچی ہو گئیں اور زمران کے دروازے پر نگہبان بیٹھ گئے اور ڈیوڑھی کے آگے سواری آ کھڑی ہوئی اور دودھیا گھوڑیاں ہنہنانے لگیں تو گیہوں پر اسرار طور پر تھوڑا پڑنے لگا اور بھوک بڑھنے لگی، اب زمران کے آٹے کی بھوسی لوگوں میں تقسیم ہونی بند ہو گئی تھی کہ یہ بھوسی اب اسی کی دودھیا گھوڑیاں کھاتی تھیں۔ جب بھوسی کی تقسیم بند ہوئی تو لوگوں نے اپنے اپنے حصّے میں آئے ہوئے آٹے کو تھوڑا جانا اور بھوکا رہ جانے کا گلہ کیا، اور زمران کے آڑیوں

نے جب آٹے کو تھوڑا پڑتے دیکھا تو اپنے دروازوں کو غنیمت جانا، اور آئندہ کا دھیان کر گندم گھر میں جمع کیا اور دروازہ لگا لیا۔ تب بستی میں آٹا اور تھوڑا پڑ گیا، اور الیملک نے اس اندیشہ سے کہ مبادا اس کی بھوک بڑھ جائے، گیہوں کا آٹا نہ پا کر جَو خریدے اور انہیں پیس کر روٹی پکائی اور پیٹ بھرا، اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے یہ کہا کہ اس قریہ میں جاؤ اور اس میں سے جو کچھ تمہارا جی چاہے کھاؤ پیو۔ پھر ظالموں نے اسے جو ان سے کہا گیا تھا بدل کر اس کی جگہ دوسری بات رکھ دی۔

الیملک جَو کی روٹی کھا کر گھر سے نکلا اور زمران کی گھوڑیوں کو بھوسی کا راتب کھاتے دیکھ کر حسرت سے بولا کہ جو رزق میرے حصّے کا تھا وہ زمران کی گھوڑیوں کے پیٹ میں چلا گیا، زمران نے اس کا یہ کلام سنا اور کہا کہ اے الیملک تو ہم میں سے ہے، سو تو ہمارے ساتھ دستر خوان پر بیٹھ اور ہمارے ساتھ روٹی توڑ۔ اس پر الیملک نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور کہا کہ میں پناہ مانگتا ہوں اس دن سے جب گیہوں کو گیہوں کے چھلکے سے جدا کر کے کھاؤں اور ظالموں میں شمار کیا جاؤں۔

زمران نے الیملک کے جواب کا برا مانا، اس نے الیملک کے سر پر غصّہ میں ڈنڈا مارا اور کہا کہ تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے، کیا تو مجھے ظالم کہے گا، کیا تو مجھے ظالم کہے گا، سو تو ہمارے درمیان سے چلا جا اور یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے تم سے یہ عہد لیا تھا کہ آپس میں خونریزی مت کرنا اور اپنوں کو اپنے ملک سے مت نکالنا۔ پھر تم نے اقرار کیا اور تم اس کے گواہ ہو، پھر وہی تم ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو اور اپنے میں سے ایک گروہ کو اپنے ملک سے نکالتے ہو اور ان کے برخلاف گناہ اور زیادتی کرنے میں ایک دوسرے کی پشت پناہی کرتے ہو۔

الیملک اپنی زوجہ کو ہمراہ لئے بستی سے نکل گیا اور دور کے جنگل میں جا کر ڈیرا ڈالا یہاں وہ بہت دنوں اپنی اکیلی جان کے ساتھ تناور درختوں اور سخت زمین سے لڑتا رہا، جب سو اوپر ساٹھواں سال تھا تو وہ تھک گیا اور مرنے کے قریب ہوا، اس کی زوجہ نے رو کر کہا کہ کیا تو مجھے اس ویرانے میں اکیلا چھوڑ کر جائے گا، الیملک نے آنکھیں کھولیں اور کہا کہ میں آنے والوں کا انتظار کروں گا۔

پھر یوں ہوا کہ اس بات کے تیسرے دن ایک قافلہ خراب و خستہ وہاں پہنچا اور الیملک سے پناہ کا طالب ہوا۔ الیملک نے انہیں پناہ دی اور پوچھا کہ اے دوستو کدھر سے آنا ہوا، انہوں نے کہا کہ ہم زمران کی بستی سے آئے ہیں، یہ سن کر الیملک کی زوجہ نے سوال کیا کہ میرے بیٹے بختاور کے بارے میں کچھ کہو، انہوں نے جواب دیا کہ تیرا بیٹا اپنی آگ کا ایندھن بن گیا۔ اس نے رافہ کے لیے زمران کی دیوار پر عقب سے کمند ڈالی، خدا تیرے بیٹے پر اپنی رحمت کرے، یہ ہماری بستی کی پہلی اونچی دیوار پر کمند تھی اور عشق کی پہلی واردات تھی۔

الیملک کی زوجہ نے یہ خبر سن کر اپنے سینے پر دو ہتڑ ماری، اور الیملک کا سر جھک گیا اور اس نے یہ کہا کہ بے شک عشق موت کی مانند زور آور ہے، ہر مرد کا زور اپنے گریبان پر چلے گا اور جو عورت جس خمیر سے اٹھی ہے اس خمیر میں واپس جائے گی۔ یہ کہہ کر الیملک نے ٹھنڈا سانس بھرا، آنکھیں بند کیں اور چپ ہو گیا، پھر کہا کہ دوسروں کی کہو۔ قافلہ والوں نے کہا کہ دوسروں کی مت پوچھ، دیوار سے گر کر مر جانا اس سے اچھا ہے کہ آدمی فاقے کر کے مرے، کھیت شاہراہوں اور اصطبلوں کی زد میں آ گئے، کھیتوں والے کچھ نگہبان بنے، کچھ سائیس ہوئے، کچھ آوارہ ہو گئے، اور گیہوں ہمارے درمیان تھوڑا رہ گیا اور گراں ہو گیا اور ہم نے زمران کی زمین کو اپنے آپ پر تنگ پایا اور نکل کھڑے ہوئے کہ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔

الیملک نے اس پر یہ کہا کہ اللہ کی زمین بے شک بہت وسیع ہے پر اللہ کے بندوں پر وہ ہمیشہ تنگ رہی، یہ کہہ کرا س نے آنکھ بند کر لی اور ہمیشہ کے لیے چپ ہو گیا۔ قافلہ والوں نے الیملک کو عزت سے دفن کیا اور الیملک کی بیوہ کو عزّت سے اپنے درمیان جگہ دی کہ الیملک نے ان کے لیے اس سخت زمین کو بہت نرم کیا تھا اور اونچے درختوں کو بہت سرنگوں کیا تھا۔ پھر وہ خود سخت زمین اور تناور درختوں کو زیر کرنے میں مصروف ہو گئے۔

پھر یوں ہوا کہ تھوڑے دنوں بعد زمران کی بستی سے ایک اور قافلہ چلا اور بھوکا یہاں پہنچا، زمران کی بستی میں قحط پڑ گیا تھا اور وہاں سے پہلے ایک قافلہ چلا اور یہاں آ کر پناہ گیر ہوا، پھر دوسرا قافلہ آیا اور پناہ گیر ہوا، پھر قافلے آتے چلے گئے اور یہاں ڈیرے ڈالتے چلے گئے۔ سب سے آخر میں وہ قافلہ آیا جس کا بزرگ سب کے بیچ بیٹھ کر سب کا بزرگ بنا اور منصف ٹھہرا۔ وہ بزرگ یہاں ان حالوں پہنچا تھا کہ اس کے پاس کچھ ساز و سامان نہ تھا۔ سوا ایک آٹے کی چھلنی کے، اور یہ پہلی آٹے کی چھلنی تھی جو اس بستی میں پہنچی۔

از کتاب " انتظار حسین کے سترہ افسانے "

انتخاب۔ وحید قمر

***

نیا سال --- مخدوم محی الدین

کروڑوں برس کی پُرانی
کہن سال دُنیا
یہ دُنیا بھی کیا مسخری ہے
نئے سال کی شال اوڑھے
بہ صد طنز ہم سب سے یہ کہہ رہی ہے
کہ میں تو نئی ہوں
ہنسی آ رہی ہے
***

یادِ رفتگاں
گرے جاتے ہیں پتے شاخسار زندگانی سے (منیب الرحمن کی یاد میں) --- سرور الہدیٰ

اب تاریخ یاد نہیں کہ منیب الرحمن کو جامعہ میں پہلی اور آخری مرتبہ کب دیکھا تھا۔ اتنا یاد ہے کہ وہ علی گڑھ سے شہریار صاحب کے ساتھ دہلی آئے تھے اور جامعہ میں ان کے لئے ایک ادبی محفل کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس انعقاد میں عبید صدیقی کا اہم کردار تھا۔ وہ بھی چند سال ہوئے رخصت ہو گئے۔ منیب الرحمن کی شخصیت میں ایک خاص کشش تھی۔ قد نکلتا ہوا تھا اور لباس سے بھی خاص طرح کی انفرادیت ظاہر ہو رہی تھی۔ سیاہ چشمہ ان کے چہرے پر کچھ زیادہ ہی اچھا لگ رہا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ بینائی بہت کم ہو گئی ہے۔ وہ جتنی دیر رہے چشمہ اتارا نہیں۔ شہر یار صاحب نے ان کے تعلق سے مختصر سی گفتگو کی تھی۔ آج اس گفتگو کو یاد کرتے ہوئے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ کسی اچھے شاعر اور ادیب سے محبت اور اخلاص کے کیا معنی ہیں۔ منیب الرحمن صاحب نے اس جلسے میں اپنی دہلی آمد کا سہرا شہریار کے سر باندھا تھا کہ یہ جب کہتے ہیں میں یہاں آ جاتا ہوں۔ منیب الرحمن صاحب کی آواز میں کچھ ایسی کھنک تھی کہ مائک کی ضرورت نہیں تھی۔ دھیرے دھیرے بول رہے تھے۔ چہرے سے طمانیت اور سرشاری دونوں ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ سب کے ساتھ تھے۔ مگر شاید کسی کو ٹھیک سے دیکھ نہیں رہے تھے۔ شہریار صاحب بالکل پاس بیٹھے ہوئے تھے لہٰذا گفتگو کرتے ہوئے دونوں اسٹیج پر بغل گیر ہو جاتے۔ وہ کس کو دیکھ رہے تھے، یہ سوال آج میرے لئے زیادہ اہم ہو گیا ہے۔ اگر اس کا جواب یہ ہے کہ وہ کسی کو بھی نہیں دیکھ رہے تھے تو گویا ان کی نظر میں غیاب کا ایک تصور تھا جسے موجودگی کا غیاب کہنا چاہئے۔ جو موجود ہے اسے غیاب کے طور پر دیکھنا بہت مشکل ہے۔ یہ وہ دیکھنا ہے جس کی عمر بہت لمبی ہوتی ہے۔ مجھے نرمل ورما کا ایک جملہ یاد آ رہا ہے جو ان کے مضمون 'بورخیس لندن میں' کا ہے۔ کہ بورخیس دیکھ رہے تھے اور کسی کو بھی نہیں دیکھ رہے تھے۔ 0 کے سیاہ چشمے کے پیچھے کتنی بینائی تھی میں اس کی تحقیق نہ اس وقت کر سکتا تھا اور نہ آج اس کی ضرورت ہے۔ بینائی کا زیادہ یا کم ہونا دونوں کا تعلق وقت اور صورت حال سے ہے۔ بہت قریب کی شئے دور معلوم ہونے لگتی ہے اور ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتی ہے۔ دور کی شئے قریب کی معلوم ہوتی ہے۔ منیب الرحمن کی آواز ہر ایک تک پہنچ رہی تھی اور ان کی شخصیت کا جادو بھی اپنا کام کر رہا تھا۔ میں نے بہت کم ایسی ادبی شخصیات کو دیکھا ہے جس کی موجودگی محفل کو اس طرح متاثر کرے۔
وہ 18 جولائی 1924 کو آگرہ میں پیدا ہوئے اور 28 نومبر 2022 کو ویسٹ ورجینا میں ان کا انتقال ہوا۔ 98 سال کی یہ زندگی کئی اعتبار سے متاثر کرتی ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں بہت کم تحریر سامنے آئی۔ 2019 میں انجمن ترقی اردو ہند دہلی سے ان کی شعری کلیات 'سرمایۂ کلام' شائع ہوئی۔ اس کلیات کی اشاعت کے بعد بھی سناٹا ٹوٹا نہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک شام شمیم حنفی صاحب منیب الرحمن کی شاعری کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اس مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ آخر کیوں ان کے معاصر نظم نگاروں کے بارے میں ان سے زیادہ کیوں باتیں ہوئیں۔ ان کا خیال تھا کہ

مجید امجد، اختر الایمان، فیض، میراجی آگے پیچھے یہ سب جمع ہو گئے اور اس گھیرے کو توڑنا ممکن نہیں تھا۔ منیب الرحمن کی شاعری کو ان شعرا کے ساتھ رکھ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیدار بخت نے دو صفحے میں تعارف کے عنوان سے منیب الرحمن کے شعری سفر کے بارے میں لکھا ہے۔ ابتدا میں وہ فیض، میراجی، سردار جعفری، اختر الایمان اور راشد کی اموات کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھتے ہیں۔

"ہم عصر اور ہم مرتبہ جدید اردو شاعروں میں اب صرف منیب الرحمن رہ گئے ہیں۔ خدا انہیں سلامت رکھے۔ ان کی شاعری کا سفر کوئی آٹھ دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے باوجود کے ان کی عمر ترانوے سال کی ہو گئی ہے۔ اور بصارت تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ تخلیقی سوتے خشک نہیں ہوئے۔ منیب الرحمن کے متعلق بہت کم لکھا گیا ہے ایک زمانہ ہوا شہریار اور مغنی تبسم نے اپنی رائے دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ منیب الرحمن کی شاعری ایک پراسرار خوبصورت جزیرہ ہے۔ اس جزیرے کی سیر کی توفیق کم لوگوں کو ہوئی ہے۔ جنہوں نے اس کی سیر کی، جو اس منظر سے سیراب ہوئے اور جن پر اس کے بھید منکشف ہوئے انہوں نے بہت کم کسی کو اس کا اتا پتہ بتایا۔"

شہریار اور مغنی تبسم کی یہ رائے محبت سے لبریز ہے اور تخلیقی بھی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ منیب الرحمن کی شاعری کو کم پڑھا گیا اور اس پر کم لکھا گیا۔ کسی شاعر کو زیادہ یا کم پڑھا گیا اس کا فیصلہ تحریر اور تقریر سے ممکن ہے۔ لہٰذا یہ بات تسلیم کر لینے میں کوئی حرج نہیں کہ منیب الرحمن کے تعلق سے ادبی معاشرے نے جو رویہ اختیار کیا اس میں ممکن ہے کوئی تعصب نہ ہو مگر ایک فاصلہ ضرور تھا۔ وہ اپنے وطن سے دور بھی رہے لیکن ان کا کلام تو بہر حال موجود تھا۔ نقطۂ موہوم کی شاعری اکثر لوگوں کی توجہ کا مرکز رہی۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ کسی عہد کا کوئی اسلوب دیگر اسالیب کو بے دخل تو نہیں کرتا مگر وہ کسی نہ کسی طور پر متاثر ضرور کرتا ہے۔ فوراً ہمارے ذہن میں وہ خیالات ابھرنے لگتے ہیں جن کا تعلق پر اسرار اور تہہ دار متن سے ہے۔ مگر پر اسرار اور تہہ دار متن صرف وہی نہیں ہوتا جس کو پڑھتے ہوئے ذہنی طور پر مشقت کرنی پڑتی ہے اور ہم کئی معنی برآمد کرتے ہیں۔ اسرار کا تعلق کسی ایک اسلوب سے نہیں ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے ان کی شاعری کے بارے میں لکھا تھا کہ 'ان کی شاعری میں وہ چیز تو بہت ہے جسے ہم احساس کی شدت اور جذبے کا ارتکاز یعنی پیشن کہہ سکتے ہیں لیکن شاعر کا زیادہ تر زور اس پیشن کو کھل کر بیان کرنے میں تو نہیں بلکہ اس کی طرف اشارہ کرنے میں صرف ہوا ہے۔ منیب الرحمن برہمی کی بات بھی آہستہ لہجہ میں کہتے ہیں۔'

منیب الرحمن کی اس کلیات کو پڑھتے ہوئے جو وقت گزرا ہے وہ اس لحاظ سے یادگار ہے کہ ہر قرأت میں نظم کا کوئی نہ کوئی حصہ فکر و خیال کے ساتھ کھو گیا ہے۔ لہجہ جس کی طرف فاروقی صاحب نے اشارہ کیا اس میں کوئی شور نہیں ہے اور اس لہجے میں گہرائی پیدا کرنے کی کوئی خارجی کوشش بھی دکھائی نہیں دیتی۔ ان کی ایک نظم 'بڑھاپا آ چکا ہے' اگر اسے توجہ سے پڑھا جائے تو محسوس ہو گا کہ شاعر نے کس طرح بڑھتی ہوئی عمر کو محسوس کیا ہے اور اس احساس کو کائناتی بنانے کی غیر ضروری طور پر کوشش نہیں کی مگر جس انداز سے زندگی کے گزران کو دیکھا ہے اور اسے جو زبان دی ہے وہ شاعری کا اعلا نمونہ ہے۔

گرے جاتے ہیں پتے شاخسار زندگانی سے
ہوا کا ایک ہی جھونکا اڑا لے جائے گا ان کو
جوانی خود فراموشی تھی، غفلت تھی
جسے ہم عمر لافانی سمجھتے تھے
بڑھاپا زندگی کی فرصت محدود ہشیار کرتا ہے
دل منکر کو چلنے کے لئے تیار کرتا ہے

منیب الرحمن نے اپنی یوم پیدائش پر بھی نظم کہی ہے جس میں موت کی آہٹ بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ انہوں نے کچھ ایسے موضوعات پر بھی نظمیں کہیں جو بہت سامنے کی ہیں اور جن کا تعلق فطرت سے ہے۔ ایسی بہت سی نظمیں ہیں جنہیں پڑھتے ہوئے وقفے اور خاموشیوں کا احساس ہوتا ہے۔ ایک نظم 'خاموشی' ہے جو شاعر کو کائنات کے شور میں ہر طرف چھپی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اسے سننے اور محسوس کرنے کے لئے شاعری میں جس زبان کی ضرورت ہے وہ زبان بھی اکثر خاموشی کا ساتھ نہیں دیتی اور وہ اسے شور میں تبدیل کر دیتی ہے۔ منیب الرحمن نے شہریار کے انتقال پر ایک نظم کہی تھی جسے آصف فرخی نے دنیا زاد میں شائع کیا تھا اور ایک نظم 'دیدہ ور ہو کوئی' شہریار کے نام معنون کی گئی تھی۔ کسی طرح ان کی ایک نظم امراؤ جان ادا کراچی میں ہے وہ بھی شہریار کے نام ہے۔ اقبال اور برگساں کے تعلق سے بہت کچھ لکھا گیا۔ اس تناظر میں ان کی ایک نظم 'اقبال اور برگساں کی ملاقات' دیکھی جا سکتی ہے۔

***

لوبان کا دھواں: منیب الرحمٰن کی شاعری کا سر نامہ --- شاہین

منیب الرحمٰن اب سے پچاسی برس قبل ۱۸، جولائی ۱۹۲۴ء کو آگرے میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے تاریخ اور فارسی میں ایم اے کیا۔ ۱۹۴۵ء میں لندن گئے جہاں کی یونیورسٹی سے ۱۹۵۳ء میں جدید فارسی شاعری پر پی ایچ ڈی لے کر ہندوستان لوٹے۔ لندن میں اپنے آٹھ سالہ قیام کے دوران پڑھائی کے ساتھ ساتھ بی بی سی میں ملازمت بھی کی اور ایک سوئس لڑکی ایلزابتھ مور (Elizabeth Mohr) سے شادی بھی۔ ایلزابتھ اپنی سسرال میں زیبا کے نام سے جانی گئیں۔ منیب الرحمٰن سترہ سال تک علی گڑھ میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۷۰ء میں، امریکہ جانے سے پہلے، وہ ادارۂ علوم اسلامیہ کے ڈائرکٹر تھے۔ زیبا اس دوران علی گڑھ میں ہی، جہاں انہوں نے اپنے آپ کو نئے ماحول میں ڈھال لیا تھا، جرمن اور فرانسیسی زبانیں پڑھاتی رہیں۔ منیب الرحمٰن ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۴ء تک امریکہ کی ریاست مشیگن کی اوک لینڈ یونیورسٹی، راچسٹر سے وابستہ رہے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہ اسی ریاست میں واقع ایک دوسرے شہر این آربر منتقل ہو گئے۔ زیبا کا اسی شہر میں ۶، جنوری ۲۰۰۲ء کو انتقال ہو گیا۔ منیب الرحمٰن کا اب تک کا آخری مجموعہ ''ہجر و فراق کی نظمیں'' انہی کی یاد میں لکھے ہوئے کلام پر مشتمل ہے۔

اب تک ان کے چھ شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں: بازدید (انتخاب۔ ۱۹۶۵ء)، شہرِ گمنام (۱۹۸۳ء)، بازدید (مکمل۔ ۱۹۸۸ء)، نقطۂ موہوم (۱۹۹۹ء)، سڑکوں کے چراغ (۲۰۰۵ء) اور ہجر و فراق کی نظمیں (۲۰۰۸ء)۔ ڈاکٹر بیدار بخت ہندی زبان میں منیب الرحمٰن صاحب کی شاعری کا ایک انتخاب ترتیب دے رہے ہیں جو جلد ہی منظرِ عام پر آ جائے گا۔ (دیکھئے نوٹ ۲۔ مدیر) اس کے علاوہ ان کے شیکسپیر کے دو ڈراموں 'جولیس سیزر' اور 'انطونی اور قلوپطرہ' کے ترجمے بھی چھپ چکے ہیں۔ نیز جدید فارسی شاعری پر ان کی کتاب اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک اہم تصنیف ہے۔ ان کے بہت سارے مضامین رسائل اور انسائیکلوپیڈیا میں بکھرے پڑے ہیں اور اب تک غیر مدون ہیں۔

یہاں اس مختصر سی تحریر میں ہم ان کی شاعری کا صرف ایک جزوی جائزہ لیں گے۔ منیب صاحب کی ایک مختصر نظم یوں ہے:

ایک راہ چلتے سے
میں نے راستہ پوچھا
بھائی یہ سڑک کیا ہے
پہلے اس کے پتھر پر
نام اور ہی کچھ تھا
آج اور ہی کچھ ہے
مسکرا کے وہ بولا
نام تو ہمیشہ ہی
یوں بدلتے رہتے ہیں
یہ سڑک مگر اب بھی
ہے وہی جو پہلے تھی

منیب الرحمٰن صاحب کے شعری مجموعے ''سڑکوں کے چراغ'' کی یہ نظم جس کا عنوان 'سڑک کا نام' ہے بادی النظر میں بہت زیادہ توجہ نہیں چاہتی۔ روایتی ہیئت میں کہی گئی یہ نظم جس کے الفاظ سادہ ہی نہیں بلکہ بالکل سامنے کے ہیں موضوع کے اعتبار سے بھی ایسی لگتی ہے کہ بس سرسری گزر جائیے۔ ہیئت روایتی اس طرح ہے کہ سارے گیارہ کے گیارہ مصرعے برابر وزن کے ہیں۔ مصرعے چھوٹے بڑے نہیں۔ البتہ ردیف قافیے کا کوئی باقاعدہ، مروج التزام نہیں۔

غور سے دیکھیں تو دوسرے، پانچویں، اور ساتویں مصرعے ہم قافیہ ہیں (پوچھا، تھا، بولا)۔ پھر آٹھویں، دسویں، اور گیارہویں مصرعے میں بھی یہ پابندی نظر آتی ہے (ہی، بھی، تھی)۔ لیکن قافیوں کی یہ بے قاعدگی نظم کو پابند نہیں رہنے دیتی۔ تکنیکی اعتبار سے یہ نظم معریٰ کہلائے گی۔ چنانچہ یہ روایتی ڈگر سے کچھ ہٹی ہوئی چیز معلوم ہوتی ہے۔ ذہن میں ایک شک سا ابھرتا

ہے کہ شاید شاعر نظم کی روایتی ساخت کے التزام سے مکمل آگاہی نہیں رکھتا۔ لیکن نظم پڑھتے ہوئے روانی اور غنائیت کہیں مجروح نہیں ہوتی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ میدانی علاقے کی کوئی ندی سبک خرامی کے ساتھ آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ الفاظ پر نظر ڈالیں تو ہر لفظ پر عام بول چال کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ کیا شاعری کی زبان اتنی سادہ اور آسان ہوتی ہے؟ شاعری میں الفاظ کی نوعیت کچھ ایسی تو ہو جو شعر اور نثر کے فرق کو سمجھنے میں معاون ہو۔ نون میم راشد کی نظم 'گداگر' کے اس ٹکڑے کی لفظیات ہمیں کسی اور سطحِ مرتفع پر لے جاتی ہے:

اسی اک ذرے کی تابانی سے
کسی سوئے ہوئے رقاص کے دست و پا میں
کانپ اٹھتے ہیں مہ و سال کے نیلے گرداب
اسی اک ذرے کی حیرانی سے
شعر بن جاتے ہیں اک کوزہ گرِ پیر کے خواب

'سڑکوں کے چراغ' کے شاعر کے ہاں الفاظ کی صورت گری کچھ اور ہے۔ بلند آہنگی سے گریز کے ساتھ دھیمے لہجے میں پڑھنے اور سننے والے کا اعتماد حاصل کرتے ہوئے کسی گہری بات، کسی زیریں لہر کو شعور میں اتار کر اسے شعر کے وسیلے سے دلوں کے تار میں لرزش پیدا کرنے کا ہنر جس میں سیروں لہو خشک ہوتا ہے منیب الرحمٰن کا نشانِ امتیاز ہے۔ 'راہ چلتے' اور 'بھائی' اور 'پتھر' ان تین لفظوں کے ساتھ تھوڑی دیر ٹھہریں۔ 'راہ چلتے' کے کئی مترادفات ہیں، مثلاً مسافر، راہی، راہگیر، رہ نورد، جادہ پیما وغیرہ۔ نظم کے پہلے مصرعے 'ایک راہ چلتے سے' کی کئی متبادل صورتیں ممکن تھیں:
رک کے ایک راہی سے / اک بھلے مسافر سے / ایک جادہ پیما سے
لیکن ان میں سے کسی میں بھی ہم وہ بات ڈھونڈنا چاہیں جسے سادگی اور بے ساختہ پن کہتے ہیں تو ہمیں مایوسی ہو گی۔ نیز 'بھائی' کہہ کر مخاطب کرنے سے پوچھنے والا اپنائیت کی ایسی فضا تخلیق کرتا ہے جس میں جواب ملنے کے امکانات زیادہ وسیع ہو جاتے ہیں۔ 'پتھر' سے مراد سنگِ میل یا میل کا پتھر ہے۔ سیاق و سباق سے 'پتھر' کا سنگِ میل ہونا ظاہر ہے۔ مزید وضاحت سے بیان کی خوبصورتی میں کمی واقع ہو جاتی۔ مشہورِ زمانہ مصور پبلو پکاسو ایک بیل کا خاکہ بنانے میں کم سے کم لکیریں استعمال کرتا گیا۔ جب اسے یہ احساس ہو گیا کہ اب ایک لکیر بھی کم کی گئی تو وہ خاکہ کچھ اور بن جائے گا بیل نہیں رہے گا اس نے وہیں اپنا ہاتھ روک لیا۔ اس طرح ایک شاہکار وجود میں آیا۔ شاعر بھی اسی طرح الفاظ کی فضول خرچی سے اجتناب برتتا ہے۔ کم کہہ کر زیادہ کہنا بڑے شاعر کا وصف ہے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ شعر میں سادہ اور آسان اور جامع الفاظ کا خلاقانہ اظہار ہما شما کے بس کی بات نہیں۔ موضوع کے اعتبار سے دیکھیں تو سڑک ایک استعارہ ہے۔ نام بدلتے رہتے ہیں۔ زندگی، وقت، عقائد، تہذیب اور تاریخ کا تسلسل کسی نہ کسی شکل میں قائم رہتا ہے۔ سڑکوں کے نام بدلیں یا شہروں کے یا تہذیبوں کے۔ پاٹلی پتر عظیم آباد کہلائے یا پٹنہ، بھاگ نگر حیدرآباد بن جائے، لائل پور فیصل آباد اور منٹگمری ساہیوال میں تبدیل ہو جائے یہ محض ناموں کا ہیر پھیر ہے۔ موئن جو دارو سے اہرامِ مصر تک بھی یہی سلسلہ ہے۔ سڑک زندگی، معاشرہ، تہذیب اور تاریخ کا استعارہ ہے۔ قحط دمشق کا ہو یا بنگال کا ان کے اسباب و علل میں بنیادی تبدیلی نہیں آتی۔ ہیروشیما، برلن، بغداد، اور بامیان وقت کی شاہراہ کے سنگِ میل ہیں۔ اور سب ایک تسلسل سے ہم رشتہ ہیں۔ منیب الرحمٰن صاحب کی گیارہ سطروں کی یہ مختصر سی نظم ایک قادر الکلام شاعر کی تخلیقی صناعی کا شاہکار ہے۔
ایک ذرا غور کیجیے تو اس وسیع کائنات میں سڑک پر راہ چلتے مسافر کی طرح فرد کا وجود اپنے زمانی و مکانی تناظر میں تو کسی حد تک تھوڑی بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے لیکن اس کے آگے ایک بڑا خلا ہے۔ ہر شخص اس خلا کو اپنے طور پر پُر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ الہ آباد کی جانکی بائی نے اپنی شخصیت کی توسیع کرتے ہوئے اس میں دوامیت کا رنگ بھرنے کی جو امکانی کوشش کی وہ ہر فرد کی آرزو مندی کا مظہر ہے۔ نظم ''اور گانا ختم ہوتا ہے'' کا یہ اقتباس دیکھیے:

غم آلودہ سروں میں اس نے فانی کی غزل چھیڑی
وہ جب اس شعر پر پہنچی:
'سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ'
تو مجمع جھوم جھوم اٹھا
مری دھندلائی یادوں میں وہ منظر اب بھی زندہ ہے

نہ جانے اس پہ کیا گذری
کسی سے میں اگر بالفرض اس کا نام لیتا ہوں
سوال آمیز نظروں سے وہ میری سمت تکتا ہے
گذشتہ نقش کتنے ہی زمانے نے مٹا ڈالے
نہ وہ انسان زندہ ہیں نہ وہ گھر بار باقی ہیں
طریقِ زندگی بدلا، مذاقِ فکر و فن بدلے
خیالوں میں گراموفون پر کوئی پرانا گیت بجتا ہے
اچانک چونک پڑتا ہوں
مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے گائکہ اپنی بقا کا حق جتاتی ہو
وہ جیسے جانتی ہو لوگ اس کو بھول جائیں گے
نہ جانیں گے کہ اس کا نام کیا تھا، مشغلہ کیا تھا، وطن کیا تھا
صدا آتی ہے میں ہوں جانکی بائی
الہ آباد والی۔ اور اس کے ساتھ گانا ختم ہوتا ہے۔

موت زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ پھر بھی انسان کو فطری طور پر اپنی زندگی میں اپنی بے وقعتی اور بے نشانی کا غم بے کل رکھتا ہے۔ مجید امجد کی نظم 'آٹوگراف' میں واحد متکلم جو شاعر خود ہے کرکٹ کے کھلاڑی کو مہ وشوں کے درمیان کھڑے آٹوگراف دیتے ہوئے حسرت آمیز نظروں سے دیکھتا ہے۔ تخلیقی کام سرانجام دینے کی ارفع ترین کاوش اور اس میں کامرانی کے با وصف معاشرہ اسے وہ مقام نہیں دیتا جو اس کا حق ہے۔ ایک غیر اہم شخص کی تخلیق کردہ غیر مطلوبہ جنس لا تعلق خریدار کے لئے اور وہ بھی بلا قیمت۔ کسی بھی تخلیقی ذہن کے لئے اس سے بڑے المیے کا تصور محال ہے۔

وہ باؤلر ایک مہ وشوں کے جمگھٹوں میں گھر گیا
وہ صفحۂ بیاض پر بصد غرور کِلکِ گوہریں پھری
حسین کھلکھلاہٹوں کے درمیاں وکٹ گری
میں اجنبی میں بے نشاں
میں پا بہ گل
نہ رفعتِ مقام ہے، نہ شہرتِ دوام ہے
یہ لوحِ دل! یہ لوحِ دل!
نہ اس پہ کوئی نقش ہے، نہ اس پہ کوئی نام ہے !

منیب الرحمٰن صاحب کی ایک اور انتہائی خوبصورت نظم 'معمولی انسان ہونے کا فائدہ' بھی اسی المیے سے تعلق رکھتی ہے اگرچہ انہوں نے اپنے لئے حرفِ تسلی کا پہلو ڈھونڈ نکالا ہے جو نظم کے عنوان سے بھی ظاہر ہے۔ سہ ماہی 'فنون' لاہور (مدیر: احمد ندیم قاسمی) کے شمارہ ۱۱۴ میں مطبوعہ یہ پہلی نظم اپنے اندر منیب صاحب کی جملہ شعری خصوصیات کا احاطہ کرتی ہے۔ سلاستِ بیان، روانی، سادگی، فکر اور جذبے کا حسین امتزاج، لفظ نگینے کی طرح جڑے ہوئے، ابہام اور الجھاؤ سے پاک، نظم بول اٹھتی ہے کہ
یہ جس کے کلکِ گوہریں کی تخلیق ہے وہ منیب الرحمٰن کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ یہاں یہ بات ذہن نشیں رہے کہ شاعری بغیر فکر کے بھی ممکن ہے اور اردو کے شعری سرمائے میں اس کی بہتات ہے، لیکن اچھی اور بڑی شاعری بغیر فکر کے وجود میں نہیں آتی۔ اس نظم میں جذبے اور فکر کے قرآن السعدین سے درد مندی کی جو فضا ابھرتی ہے وہ شاعر کے تئیں اپنے آپ کو
منطقی طور پر 'یہی اچھا ہے' سمجھانے کے باوجود گلہ گزاری کا انداز رکھتی ہے۔ نظم کی قرأت کے بعد یہ تاثر نہیں بندھتا کہ نظم کا واحد متکلم اپنی شدید محرومیوں کے با وصف اپنی کھال میں مست کسی گوشۂ امن میں آسودہ و دلشاد ہے، بلکہ غالب تاثر یہ ہے کہ افسوس زمانہ ایسے گراں مایہ جوہر کا قدر شناس نہیں۔ یہی اس نظم کی کامیابی ہے۔ پوری نظم یوں ہے:

سوچتا ہوں کہ مری عمرِ رواں کی کشتی

اب کنارے کے قریب آ پہنچی
کون سا میں نے بڑا کام کیا
شہرتِ عام کی کس دوڑ میں بازی جیتی
شاعری کی مگر اعزاز کے لائق نہ ہوا
نہ ملی علم کے میداں میں فضیلت مجھ کو
مائلِ کذب و ریا تھی نہ طبیعت میری
خوش نہ آئی کبھی بھولے سے سیاست مجھ کو
زندگی کہنے کو بے سود کٹی
پھر بھی قسمت سے نہیں کوئی شکایت مجھ کو
کامیابی پہ کسی کی نہ مجھے رشک آیا
نہ کسی نے بھی مجھے چشمِ حسد سے دیکھا
ایک گمنام سے ہو سکتا ہے خطرہ کس کو
کس نے ایسے کو بھلا نیتِ بد سے دیکھا
گوشۂ امن میں آسودہ و دلشاد رہا
شکر ہے کینۂ دنیا سے میں آزاد رہا
(معمولی انسان ہونے کا فائدہ)

ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ منیب الرحمٰن صاحب نے اپنی پُرکار نظموں سے اردو کے شعری ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ ان کے ہاں ایک ایسے ماضی کی بازیافت کا احساس بھی ہوتا ہے جو یکسر معدوم ہو چکا ہے یا جو زمانے کی بدلتی قدروں کے پیمانے کی میزان پر اب پورا نہیں اترتا۔ یہاں اس ماضی سے وابستگی کے ساتھ یادوں کی اداس شاموں کی ڈوبتی آوازوں میں ایک دل گداز نوحے کی آواز بھی شامل ہے:

شام کے آئے ہوئے مہمان سارے جا چکے ہیں
گفتگو، بحثیں، لطیفے
ان کی سب باتیں سپردِ طاقِ نسیاں ہو گئی ہیں
میں اکیلا رہ گیا ہوں
اے اندھیری رات تو اپنے لبادے میں مجھے ملفوف کر لے
اے ستارو تم اتر آؤ فلک سے
میرے دل کی کوٹھری میں
اس گھڑی آہوں کے لوبانی دھوئیں میں
میری تنہائی دعا میں ڈھل گئی ہے (شبگیر)

منیب الرحمٰن صاحب کے شعری مزاج کی نہاد کلاسیکی ہے جس پر جدید طرز کی بنی پُر کشش عمارت دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے، لیکن اس تاج محل کے حسن کے مکمل ادراک کے لئے اس کے خارج اور باطن کی روح تک رسائی لازمی ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں آہوں کے لوبانی دھوئیں میں تنہائی دعا میں ڈھل جاتی ہے۔

نوٹس:
۱۔ اتوار، ۲۶ جولائی ۲۰۰۹ء۔ کینٹن، مشیگن، یو ایس اے۔ منیب الرحمٰن صاحب کی پچاسی ویں (۸۵) سالگرہ پر صوفیہ انجم تاج کے دولتکدے پر منعقدہ ایک تقریب میں پڑھی گئی تحریر۔ گذشتہ ۱۸ جولائی ۲۰۲۲ء کو وہ اٹھانوے (۹۸) برس کے ہو گئے۔ خدا انہیں تا دیر سلامت رکھے---- شاہین)
۲۔ ۲۰۱۹ء میں ڈاکٹر بیدار بخت کی محنت اور کوشش سے ڈاکٹر منیب الرحمان کا سارا کلام '' سرمایۂ کلام'' کے نام سے انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام چھپ گیا ہے۔ شاہین۔
***

لفظوں کے بازیگر۔ اردو کے نامور شاعر ڈاکٹر منیب الرحمن سے گفتگو --- گوہر تاج

مجھے ڈیٹرائیٹ میں منعقد ہونے والی شعری نشستوں میں شرکت کا بارہا موقعہ ملا جہاں اکثر داد و تحسین اور واہ واہ کے شور و شین میں جب ایک شاعر کے نام کا اعلان کیا جاتا ہے تو ایک لمحہ کو ان کے استقبال میں خاموشی سی طاری ہو جاتی ہے اور تب ایک سیدھے، اکہرے جسم کے ایک شخص پر وقار انداز سے مائیک کی جانب محو خرام ہوتے ہیں۔ دفعتاً ان کی شاعری کا رعب حسن سامعین کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ لگتا ہے کہ بھرے مجمع کے سناٹے میں آغا حشر کا کوئی کردار نظمیہ مکالمے ادا کر رہا ہے۔
مجھے اس وقت یہ با وقار بزرگ شاعر پائیڈ پائیپر کی مانند نظر آتے ہیں جو اپنی گہری اداسی کے سناٹوں سے ہم کلامی کے عالم میں تمام سامعین محفل کو اپنے ساتھ لیتے ہوئے ماضی کے پاتال میں اتر جاتے ہیں کہ جہاں ان کی خوبصورت یادوں کی بازگشت سب کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔ شاعری کے ان ساحر کا نام ہے پروفیسر منیب الرحمن، ملاحظہ فرمائیں۔

تم جو آؤ تو دھندلکوں میں لپٹ کر آؤ
پھر وہی کیف شام لئے
جب لرزتے ہیں صداؤں کے سمٹتے سائے
اور آنکھیں خلش حسرت ناکام لیے
ہر گزرتے ہوئے لمحے کو تکا کرتی ہیں
خود فریبی سے ہم آغوش رہا کرتی ہیں
(باز دید)

ایک سرمئی شام مجھے این آربر (مشیگن) کے ایک سنسان محلے میں مقیم منیب الرحمن صاحب کی رہائش گاہ جانے کا موقعہ ملا۔ وہ گھر جس کے وہ واحد مکین ہیں، بلاشبہ ایک علم دوست اور فن و ادب شناس کا مسکن دکھائی دیتا ہے جہاں کی دیواروں پر خوبصورت فن پارے اور تمام ممکنہ جگہوں پر کتابوں کے ڈھیر تھے۔
منیب الرحمن صاحب گزشتہ کئی سالوں سے اپنی ماضی کی انگنت یادوں اور خوبصورت شاعری کے سہارے اس مسکن کو آباد رکھے ہوئے ہیں۔ وہ خاموش طبع ہیں تاہم ان کی کم آمیزی کے باوجود ہمیں ان کی ماضی کی پرتیں اتارنے کا خاطر خواہ موقعہ مل ہی گیا۔
انہوں نے بتایا ’’میری پیدائش آگرہ میں 18 جولائی 1924ء کی ہے۔ آبائی وطن ڈبائی ضلع بلند شہر ہے جو علی گڑھ سے تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ہمارے والد اکرام حسین صاحب پولیس کے محکمہ میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ابتدائی تعلیم الہ آباد کے اسکول میں ہوئی جو ایک رومن کیتھولک اسکول تھا۔ وہاں سال ڈیڑھ سال ہی تعلیم حاصل کی تو پھر والد کا تبادلہ ایک بار پھر آگرہ ہو گیا۔ جہاں شعیب محمدیہ اسکول سے آٹھویں جماعت پاس کی۔ جبکہ والد کے ایک بار پھر تبادلہ کے باعث دسویں جماعت اپنے قصبہ ڈبائی کے ہائی اسکول سے 1936ء میں پاس کی۔ میرٹھ کالج سے انٹر کر کے علی گڑھ کالج چلے گئے جہاں سے بی اے، ایم اے (تاریخ اور فارسی) کیا۔ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز سے فارسی میں پی ایچ ڈی (1950ء) میں مکمل کی۔ پھر علی گڑھ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔‘‘
منیب الرحمن صاحب کی زندگی کا سب سے حسین موڑ اس وقت آیا جب ان کی ملاقات سوئٹزرلینڈ کی رہنے والی دوشیزہ الزبتھ سے ہوئی۔ جن سے ان کی شادی 1952ء میں ہوئی۔
اپنے ملاپ کا ذکر انہوں نے کچھ اس طرح کیا۔ ’’میں اپنے کسی کام کے سلسلے میں پیرس گیا ہوا تھا۔ وہ وہاں نیو ویک کے دفتر میں مترجم کا کام انجام دیتی تھیں۔ شادی کا فیصلہ میں نے ان سے ملاقات کے چار پانچ دن بعد ہی کر لیا تھا۔ الزبتھ نے شادی کی درخواست اس شرط پہ منظور کی کہ شادی والدین کی باہم مرضی سے ایک آدھ ماہ بعد ہو۔ اس طرح 5 فروری 1952ء لندن میں ایک مشہور صحافی دوست اقبال سنگھ کے گھر شادی انجام پائی۔‘‘
یہ سب بتاتے ہوئے ان کے چہرے پہ ماضی کی خوشگوار یادوں کی چمک رقصاں تھی۔

اب تیرے جسم سے اٹھتی ہوئی خوشبو کی لپٹ
میرے احساس پہ آویزاں ہے
گرم ہے کمرے کی خاموش فضا
تیرے عارض پہ پسینے کے نمی
ذہن میں لاتی ہے برسات کے پہلی راتیں

انہوں نے اپنی مغربی معاشرہ میں پروان چڑھی اہلیہ (جنہیں انہوں نے زیبا نام دیا تھا) کا مشرقی زندگی برتنے کا تجربہ بیان کیا۔ ''وہ اٹھارہ سال ہندوستان میں رہیں اور اس دوران با محاورہ اردو سیکھ لی تھی۔ وہ میرے ساتھ ہی علی گڑھ یونیورسٹی میں فرانسیسی اور جرمن زبان کی استاد مقرر ہو گئی تھیں۔ اسی دوران ہمارے تین بچے آزاد، ثمینہ اور سالک پیدا ہوئے۔ 1970ء میں ہم سب امریکہ آ گئے۔
اپنی امریکہ آمد کے متعلق انہوں نے بتایا ''میری 1970ء میں مشیگن کے اوکلینڈ یونیورسٹی کے ماڈرن لینگویج کے شعبہ میں بطور استاد تقرری ہوئی اور جب سے یہیں مقیم ہوں۔'' وطن چھوڑنے کا تجربہ کوئی آسان نہیں۔ منیب الرحمن صاحب کی شاعری میں ہجرت کے تجربات کا دکھ نمایاں ہے خاص کر 1977ء میں لکھی ہوئی نظم 'خانہ متروک' جو انہوں نے علی گڑھ میں عارضی قیام کے دوران لکھی۔

میں آیا ہوں اپنے یہاں مہمان بن کر
کچھ روز گزاروں گا چلا جاؤں گا
مٹ جائے گا غم دوری کا دھیرے دھیرے
کیا جانیے پھر لوٹ کے کب آؤں گا

منیب الرحمن صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز 1939ء میں ہوا جب 'ادبی دنیا' لاہور میں ان کے اردو افسانے (انگریزی سے مترجم) شائع ہوئے۔ جبکہ 1940ء میں پہلی قابل ذکر نظم 'شہاب ثاقب' کے نام سے شائع ہوئی جو 'ستارہ' کے عنوان سے شعری مجموعے 'باز دید' میں شامل ہے۔
اپنی ادبی زندگی کے متعلق انہوں نے بتایا ''میرے والد صاحب کو ادب سے بہت شغف تھا اور گھر میں اچھے خاصے رسائل آیا کرتے تھے۔ آج کا سا ماحول نہ تھا۔ اس زمانے میں ہر شریف خاندان کے لوگ چاہے وہ کسی بھی پیشے سے تعلق رکھتے ہوں، رسائل سے شغف رکھتے تھے۔ ہر گھر میں اقبال، غالب اور حالی کے شعری مجموعے ہوتے تھے۔ یہی حال نثر کا تھا۔ رجب علی سرور، عبد الحلیم شرر اور فسانہ عجائب جیسی کتابیں لوگ خرید کے پڑھا کرتے تھے۔ وہ جو ماحول تھا اب ختم ہوتا جا رہا ہے۔ لوگوں کے پاس پڑھنے کی فرصت نہیں اور دلچسپی بھی کم ہو گئی ہے۔'' انہوں نے تاسف سے کہا۔
منیب الرحمن صاحب نے اپنے تخلیقی کام کے متعلق بتایا ''میری شاعری کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ باز دید، شہر گمنام، نقطۂ موہوم، اور سڑکوں کے چراغ۔ کئی تحقیقی مضامین کے علاوہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام پر بھی کام کیا ہے۔ جب تک میری آنکھیں کام کرتی رہیں میں لکھتا رہا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔
ہم میں سے اکثر اس بات سے آشنا ہوں گے کہ 1991ء میں منیب الرحمن صاحب کی ایک آنکھ کی بینائی ہیمرج کے سبب زائل ہو گئی، جبکہ 1998ء میں دوسری آنکھ کی تکلیف کے بعد اس آنکھ کی بصارت بھی معدوم ہو گئی۔ گو ان تکالیف نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو مجروح نہیں کیا تاہم کسی مدد کے بغیر پڑھنے لکھنے کا سلسلہ ضرور متاثر ہوا۔ ان کا مجموعہ کلام 'نقطہ موہوم' ان کی اسی کیفیت کا عکاس ہے۔
منیب الرحمن صاحب نے بتایا کہ ان کی شاعری پر ایلیٹ کے علاوہ غالب، میر، ن۔ م راشد اور میرا جی کا کافی اثر ہے۔ ادب زندگی پر کیا اثر ڈالتا ہے؟ کے جواب میں انہوں ںے فرمایا ''ادب زندگی کے اعلی کردار سے روشناس کراتا ہے۔''
منیب الرحمن صاحب جو گزشتہ کئی دہائیوں سے امریکہ میں مقیم ہیں، امریکہ میں اردو کے مستقبل کے حوالے سے گویا ہوئے ''اردو کی امریکہ میں بقا کے لیے والدین کو چاہیے کہ گھر پہ بچوں سے اردو میں گفتگو کریں۔ اگر ہم مساجد قائم کرتے ہیں تو ہماری ایک شناخت خود ہماری زبان بھی تو ہے۔ اردو کی تعلیم کا ان یونیورسٹیوں میں کہ جہاں اردو کے کورسز ہیں، وہاں ہمارے بچوں کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اردو کی تعلیم کا اہتمام باقاعدہ پائیلٹ پروجیکٹ کے طور پر شروع کیا جائے اور ہفتہ میں تین دن پڑھایا جائے۔ محض سنڈے اسکول میں مذہب کے ساتھ نتھی کرنے سے بات نہیں بنے گی۔ امریکہ میں اردو مشاعرے کسی حد تک اردو کی ترویج کا کام کر رہے ہیں لیکن اصل بات یہ ہے بچوں کے لیے کوئی سنجیدہ کام ہو۔'' انہوں نے اپنی خواہش کا

اظہار کیا اور ساتھ ہی ایک اہم نکتہ پر بھی روشنی ڈالی کہ ’’ایک چیز جو ہم کر سکتے ہیں وہ یہ کہ پرانے شعراء کی انتخاب کی سی ڈی بنائیں اور اسی طرح نثر کی بھی سی ڈیز تیار ہوں۔ پڑھنے والے پروفیشنلز ہوں تاکہ ہر لفظ کی جداگانہ بخوبی ادائیگی ہو۔‘‘ ساتھ ہی انہوں نے اردو بریل کی اہمیت پر پہ زور دیا۔
ہماری گفتگو اپنے انجام پہ پہنچ چکی تھی۔ اسی دوران ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، ان کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ لیکن پھر بھی ایک گھری اداسی ان کے لہجہ میں طاری ہو گئی۔
انہوں نے بتایا کہ ان کا بیٹا خاصا بیمار ہے۔ بیٹے سے دوری اور اس کی بیماری کے باعث طاری بے چینی کو میں نے شدت سے محسوس کیا۔ بحال اسی قسم کی بے بسی کی کیفیت کو منیب الرحمن صاحب نے کبھی اس طرح رقم کیا تھا۔

شام کی مرجھائی مرجھائی سی مدھم روشنی میں
کھڑکیوں کے اس طرف وہ سال خوردہ چہرے
سامنے ٹی وی کو دھندلا ہوئی آنکھوں سے تکتے
ہر بشر چھوٹی سی اک دنیائے تنہا
بچے بڑھ کر اپنے اپنے راستوں پر جا چکے ہیں
دوری جا ڈھونڈتے ہیں
اور دل کے فاصلے بھی بڑھ جاتے ہیں
صرف ٹیلی فون ہی واحد تعلق رہ گیا ہے۔
نظم ’ٹیلی فون‘

شام کے دھندلکے بڑھ چکے تھے۔ فضا میں نمی اتر رہی تھی اور میں نے منیب الرحمن صاحب سے انتہائی شکریہ کے ساتھ رخصت طلب کی۔

(یہ انٹرویو اردو ٹائمز، امریکہ میں 2008ء میں شائع ہوا۔ 28 نومبر 2022ء پیر کی صبح پروفیسر منیب الرحمن نے اپنی آخری سانسیں لیں)۔
***
(بشکریہ ’ہم سب‘ آن لائن)

نظمیں --- منیب الرحمن

نقلی پھول

میں نے جب پہلے پہل دیکھا تھا
یہ مجھے کتنے بھلے لگتے تھے
تم نے گلدان میں رکھا تھا انہیں
تھی مرے کمرے کی زینت ان سے
اور اب تھک گئیں آنکھیں میری
دیکھتے دیکھتے صورت ان کی
یہ مہکتے ہیں، نہ کمھلاتے ہیں
دن انہیں چھو کے نکل جاتے ہیں
کاش موسم کی عمل داری میں
یہ بھی پابند تغیر ہوتے
جب یہ کھلتے تو کوئی چن چن کر

گوندھتا ان کی لڑی جوڑے میں
اور جب ان پہ خزاں آ جاتی
پھینک دیتا
میں انہیں
کوڑے میں
***

سوکھا پیڑ

اس باغ میں پیڑ تھے بہت سے
جتنے تھے سبھی ہرے بھرے تھے
صرف ایک اس جھنڈ سے جدا تھا
بے برگ اداس اک طرف کھڑا تھا
دیکھا تو وہیں ٹھہر گیا میں
بے نام غموں سے بھر گیا میں
’’کیوں رک گئے‘‘ تم نے مجھ سے پوچھا
میں چپ رہا کیا جواب دیتا
کہتا کہ یہ نقش حسرتوں کا
پیکر ہے گزشتہ موسموں کا
یہ میری تمہاری داستاں ہے
مرتے ہوئے عشق کا نشاں ہے
***

پگڈنڈی

چلتے ہوئے اس پگڈنڈی پر
جب سامنے پیڑ آ جاتے تھے
ہوتا ہے گماں حد آ پہنچی
کہتے تھے قدم اب لوٹ چلو
اب لوٹ چلو اس راہ پہ جس سے آئے تھے
کچھ دور پہ جا کر لیکن یہ مڑ جاتی تھی
پیڑوں کی صفوں میں تیزی سے گھس جاتی تھی
بکھرے ہوئے پتے اوس میں تر
چھنتی ہوئی کرنوں کا سونا
چپ چاپ فضاؤں کی خوشبو
ناگاہ کسی طائر کے پروں کی گھبراہٹ
ہم آ گئے ان میدانوں میں
پھیلے ہوئے میداں اور افق کی پہنائی

اب آؤ یہاں سے گھر لوٹیں
چلتے ہوئے اس پگڈنڈی پر
***

روشنی کے مینار

دو سمندر جہاں آپس میں ملا کرتے ہیں
میں نے کتنے سحر و شام گزارے ہیں وہاں
میں نے دیکھی ہے نکلتے ہوئے سورج کی کرن
اور کل ہوتے ہوئے دن کی شفق دیکھی ہے
میں نے موجوں کے تلاطم میں گہر ڈھونڈے ہیں
اور پائے ہیں خزف ریزے بھی
جال پانی سے جب اک بار نکالا میں نے
اک گھڑا ریت بھرا ہاتھ آیا
ثبت تھی مہر سلیماں جس پر
اور کھولا تو دھوئیں کا بادل
پیٹ سے اس کے نمودار ہوا
آدمی کے لیے یہ بہتر ہے
***

گزرا ہوا دن

کل کا گزرا ہوا دن پھر مرے گھر آیا ہے
ناگہاں سینے کا ہر داغ ابھر آیا ہے

گھومتی پھرتی ہے آوارہ چمیلی کی مہک
چاند آنگن میں دبے پاؤں اتر آیا ہے

کس کے ہونٹوں کے تبسم سے بکھرتے ہیں گلاب
کون ہم راہ لیے باد سحر آیا ہے

جھٹ پٹا چھا گیا بوسیدہ گھروں کے اوپر
دور سے چل کے کوئی خاک بسر آیا ہے

کس کے اعزاز میں یہ سائے نکل آئے ہیں
آج کیا بزم میں وہ خستہ جگر آیا ہے

ایک مہمان ہے جو آ کے چلا جائے گا
دل بیمار اسے دیکھ کے بھر آیا ہے

***

تم اپنے خواب گھر پر چھوڑ آؤ

تم اپنے خواب گھر پر چھوڑ آؤ
نہیں تو خار بن کر یہ چبھیں گے
تمہاری روح کو پیہم ڈسیں گے
مبادا یہ تمہارا منہ چڑائیں
تم ان سب آئنوں کو توڑ آؤ
تم اپنی عقل و منطق پر ہو نازاں
یہ ناخن اس جگہ کیا کام دیں گے
جہاں دل کی گرہ الجھی ہوئی ہو
تمہارے ہاتھ اپنی بے بسی پر
تمہیں ہر گام پر الزام دیں گے
کہاں ہیں وہ کتابیں وہ صحائف
کہ جن میں زخم اپنے رکھ دیے تھے
اس انساں نے جو شعلوں میں جلا تھا
اس انساں نے جو سولی پر چڑھا تھا
اس انساں نے جو مر مر کر جیا تھا
تم اپنے خواب گھر پر چھوڑ آؤ
تمہاری دھوپ سایوں میں ڈھلے گی
تمہاری رات شبنم پر چلے گی
ضمیر زہر آلودہ کے چیونٹے
نہ رینگیں گے تمہاری بے حسی میں
تمہارا تن تمہارا تن بنے گا
تمہارا دل تمہارا ساتھ دے گا
تمہیں کیا چاہیئے پھر زندگی میں
تم اپنے خواب گھر پر چھوڑ آؤ
***

معمولی انسان ہونے کا فائدہ

سوچتا ہوں کہ مری عمرِ رواں کی کشتی
اب کنارے کے قریب آ پہنچی
کون سا میں نے بڑا کام کیا
شہرتِ عام کی کس دوڑ میں بازی جیتی
شاعری کی مگر اعزاز کے لائق نہ ہوا
نہ ملی علم کے میداں میں فضیلت مجھ کو

مائلِ کذب و ریا تھی نہ طبیعت میری
خوش نہ آئی کبھی بھولے سے سیاست مجھ کو
زندگی کہنے کو بے سود کٹی
پھر بھی قسمت سے نہیں کوئی شکایت مجھ کو
کامیابی پہ کسی کی نہ مجھے رشک آیا
نہ کسی نے بھی مجھے چشمِ حسد سے دیکھا
ایک گمنام سے ہو سکتا ہے خطرہ کس کو
کس نے ایسے کو بھلا نیتِ بد سے دیکھا
گوشۂ امن میں آسودہ و دلشاد رہا
شکر ہے کینۂ دنیا سے میں آزاد رہا
***

مجھے رونے دو

مجھے رونے دو رونے دو
اسی پیپل کے سائے میں
جہاں اک درد کی تاثیر کا مارا
بتاتا تھا کہ راز درد و غم کیا ہے
مداوائے الم کیا ہے
مجھے رونے دو رونے دو
جہاں مرلی کی دھن سن کر
وہ رادھائیں
کڑے جاڑے کے موسم میں
کسی کی گرمیِ آغوش سے اٹھ کر
محبت کی دمکتی چاندنی میں جا نکلتی تھیں
مجھے رونے دو رونے دو
کہ میں اک اجنبی بن کر
تمہارے در پہ آیا ہوں، مرا کشکول خالی ہے
تمہارے پاس جو دھن تھا
مرا دل آج پھر اس کا سوالی ہے
مگر تم دان کیا دو گے
کہ تم تو خود بھکاری ہو
مجھے رونے دو رونے دو
***

برف باری

برف ہر آن گرے جاتی ہے
بام و در کوچہ و میداں چپ ہیں

رات کے سایۂ لرزاں چپ ہیں
کوئی موٹر کبھی بھولے سے گزر جاتی ہے
ہر قدم گنتی ہوئی
اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے
ورنہ ہر سمت بس اک آہنی خاموشی ہے
کوئی آواز نہ سرگوشی ہے
اور یہ دل بھی کہ تھی گرمئ بازار جہاں
آج مدت سے بیابان کی صورت چپ ہے
زندگی ہے کہ کسی طور کٹے جاتی ہے
برف ہر آن گرے جاتی ہے
یہ سماں برف سے ڈھک جائے گا
راہرو راستہ چلتے ہوئے تھک جائے گا
عمر رفتہ کے خط و خال نہاں
کوئی مشکل ہی سے پہچانے گا
راز سربستہ رہیں گے دل میں
کس کو غم ہے کہ انہیں جانے گا
وقت کی گرتی ہوئی برف گرے جائے گی
ایک دھندلائی ہوئی رات کبھی آئے گی
زندگی یوں ہی گزر جائے گی
***

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی، ایک پیاری شخصیت، ایک پیارا شاعر --- سہیل انجم

علی بھائی (ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی) سے پہلی ملاقات کب ہوئی اور کیسے ہوئی یہ تو یاد نہیں لیکن میں نے پندرہ بیس سال کے تعلق کے عرصے میں ان کو ہمیشہ یکساں پایا۔ وہی شرافت، وہی شائستگی، وہی خندہ پیشانی، وہی خوش اخلاقی، وہی انکساری، وہی حسن سلوک اور وہی محبت اور وہی دوستانہ انداز۔ ان تمام اوصاف میں بیشی تو پائی لیکن کبھی کمی نہیں پائی۔ ان سے ملاقات ان کے دولت خانہ پر بھی ہوئی، آل انڈیا ریڈیو میں بھی ہوئی اور دوسرے مقامات پر بھی ہوئی۔ ہمیشہ تپاک سے ملنا اور کھل کر گفتگو کرنا ان کی فطرت اور طبیعت کا خاصہ ہے۔ وہ جس قدر قابل اور با صلاحیت ہیں اسی قدر منکسر المزاج بھی ہیں۔ لیکن ان کی ظاہری شخصیت بڑی ہی غیر متاثر کن ہے۔ اگر وہ پہلی بار کسی سے ملیں تو وہ ان سے کوئی اثر قبول نہیں کرے گا۔ لیکن ملاقات کا عرصہ جوں جوں بڑھتا جائے گا ان کے مزاج کی خصوصیات ابھرتی جائیں گی۔ اور پھر وہی شخص جس نے پہلی ملاقات میں ان کو نظرانداز کر دیا تھا ان کا احترام کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔
علی بھائی جیسے باہر ہیں ویسے ہی اندر بھی ہیں۔ نہ کوئی چھل نہ کپٹ، نہ تعصب نہ تنگ نظری، نہ معاندانہ جذبات نہ احساس برتری۔ فارسی، اُردو اور انگریزی زبانوں پر عبور رکھنے والا یہ شخص اتنا سادہ لوح ہے کہ اس پر بلا کا پیار آتا ہے۔ علی بھائی کی سادہ لوحی اور ان کی شرافت سے بہت سے لوگوں نے ناجائز فائدے بھی اٹھائے ہیں۔ انہیں لوگوں سے دھوکے بھی ملے ہیں۔ بے وفائیاں بھی ملی ہیں۔ لیکن اگر ان سے ایسے لوگوں کے بارے میں پوچھا جائے تو شاید ہی وہ کسی ایسے شخص کا نام بتا سکیں۔ اس کی وجہ وہی ان کی شرافت نفسی ہے جو انہیں دوسروں سے ممتاز بناتی ہے۔ وہ کسی بھی بات کا برا بھی نہیں مانتے۔ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ ان کی سادہ لوحی پر ہم میں سے کسی نے سخت الفاظ میں کچھ کہہ دیا لیکن انھوں نے اس کا غلط مطلب نہیں نکالا۔ نہ ہی اسے دل میں رکھا۔ نہ تعلقات کی راہ میں آڑے آنے دیا۔
میں نے اکثر دیکھا ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس کے ایک افسر اعلیٰ ان کا مذاق اڑاتے اور انہیں "استاذ الاساتذہ" کہہ کر چھیڑنے کی کوشش کرتے۔ لیکن انھوں نے کبھی نہ تو ان کے انداز گفتگو پر اعتراض کیا اور نہ ہی ان کے دل میں کبھی یہ خیال

آیا کہ انھیں ان سے قطع تعلق کر لینا چاہیے یا کم از کم ان سے ملنا جلنا چھوڑ دینا چاہیے یا کم کر دینا چاہیے۔ میں جب بھی آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس میں جاتا اور انھیں معلوم ہو جاتا تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ افسر مذکور سے آمنا سامنا ہو سکتا ہے، وہ مجھ سے ملنے ضرور آتے۔ اتفاق سے عموماً "ان" سے مڈبھیڑ ہو جاتی اور وہ اپنے روایتی انداز میں چھیڑنے کی کوشش کرتے۔ لیکن علی بھائی ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ اور سر جھکا کر ان کی باتیں سنتے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ آپ میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ اس کے بعد عموماً ہم دونوں ایک ساتھ باہر نکلے لیکن انھوں نے ایک بار بھی دبے لفظوں میں ہی سہی ان کی شکایت نہیں کی۔ دوسری طرف افسر مذکور کا رویہ یہ ہوتا کہ جب ان کی غیر موجودگی میں ان کے بارے میں گفتگو ہوتی تو وہ ان کی بے حد تعریف کرتے اور کہتے کہ اگر علی بھائی زود گوئی ترک کر دیں اور سنجیدگی کے ساتھ شاعری کریں تو بہت اچھے شاعر ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے ان کے پیٹھ پیچھے کبھی بھی ان کا مذاق نہیں اڑایا بلکہ عزت کے ساتھ ان کا ذکر کیا۔ میں کبھی کبھار سوچتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟ تو دل و دماغ سے جواب آتا ہے کہ برقی اعظمی کی صلاحیت و قابلیت اور اس کے ساتھ ہی ان کی شرافت کے قائل وہ بھی ہیں اور انھیں اس کا احساس بھی ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو اور فارسی سروس میں ایسا قابل ترین شخص کوئی دوسرا نہیں ہے۔ لیکن ان کی عادتوں اور ان کی سادہ لوح طبیعت کے پیش نظر وہ ان کو چھیڑنے پر مجبور ہو جاتے۔ صرف وہی کیوں، میں ایسے کئی لوگوں سے واقف ہوں جو ان کے سامنے تو انھیں باتوں میں اڑانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن غائبانہ میں ان کی تعریفوں کے پل باندھتے ہیں۔ اور یہ بات درست بھی ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کے اُردو اور فارسی شعبے میں ان سے قابل کوئی دوسرا شخص نہیں ہے۔ (اب تو علی بھائی اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں)۔

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی سے تعلق اور ان کی شاعری کے پیش نظر اگر کوئی ان کی شخصیت کا مطالعہ کرنا چاہے تو پھر ان کی شخصیت کی پرتیں بیک وقت کھلنے کے بجائے رفتہ رفتہ کھلیں گی۔ یہ نہیں کہ "اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے"۔ لیکن جوں جوں ان کی شخصیت کی پرتیں کھلتی جائیں گی، ایسا محسوس ہونے لگے گا کہ ہم ان کی شاعری کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اسی طرح ان کی شاعری کے بالاستیعاب مطالعہ کے ساتھ ساتھ یہ احساس قوی ہوتا جائے گا کہ ہم برقی اعظمی کی شاعری کا نہیں بلکہ ان کی طبیعت اور ان کی شخصیت کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ گویا ان کی شاعری اور شخصیت دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ ان کو ان کی شاعری سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا اور ان کی شاعری کو ان کے مزاج سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ حالانکہ عام طور پر شعراء یا فنکار اپنی شاعری اور فنکاری سے الگ نظر آتے ہیں۔ یعنی ان میں تضاد ہوتا ہے۔ لیکن ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ نہ داخلی نہ خارجی۔ دونوں حالتیں ایک دوسرے میں مدغم ہیں۔ ان کو الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

علی بھائی کی شاعری میں ان کی ذات تو پوری طرح موجود ہے ہی ان کی ذات کا کرب بھی دکھائی دیتا ہے۔ وہ کرب جو بیرونی اور اندرونی دنیا سے عبارت ہے۔ انھیں باہر سے جو کچھ ملا ہے اور اندر سے بھی جو کچھ ملا ہے وہ سب ان کے کلام میں نمایاں ہے۔ لیکن اشاروں کنایوں میں۔ نہ تو کہیں بھونڈا پن ہے اور نہ ہی حالات کا پر شور شکوہ۔ ساری باتیں بہت ہی سلیقے کے ساتھ موجود ہیں۔ لیکن عام قاری کو وہ نظر نہیں آئیں گی۔ البتہ جو ان سے ذاتی طور پر واقف ہے وہ ضرور کچھ نہ کچھ سمجھ جائے گا۔ سچ بات یہ ہے کہ زمانہ نے ان کی قدر نہیں کی۔ زمانہ کو چھوڑیے، اپنوں سے بھی انھیں وہ محبت، اپنائیت اور عزت و وقار حاصل نہیں ہوا جس کے وہ مستحق ہیں۔ لیکن برقی اعظمی "نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ" میں یقین رکھتے ہیں۔ اسی لیے بہت سی بیرونی و اندرونی ناہمواریوں کے باوجود ان کی زندگی میں بظاہر کوئی کجی نظر نہیں آتی۔ اپنے بے تکلف دوستوں سے گفتگو میں وہ بہت سی باتیں ضرور بتاتے ہیں لیکن لطف لے لے کر۔ اپنی ناقدری کو بھی وہ لطف لے کر بتاتے ہیں۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ انھوں نے کوئی ایسا واقعہ بیان کیا ہو جس سے ان کو تکلیف پہنچی ہو اور انھوں نے اس پر دکھ یا ملال کا اظہار کیا ہو۔ وہ ان واقعات سے بس ایسے گزر جاتے ہیں جیسے گلشن میں چہل قدمی کرتے وقت کچھ کانٹے آ جائیں اور ان سے دامن کشاں گزر جایا جائے۔

میں علی بھائی کی شاعری پر کچھ زیادہ اظہار خیال نہیں کروں گا۔ کیونکہ ایک درجن سے زائد لوگوں نے ان کی شاعری پر مضامین قلمبند کیے ہیں اور اب ان کی شاعری کا کوئی ایسا گوشہ بچا نہیں ہے جس پر کچھ لکھا نہ گیا ہو۔ ہاں یہ بات ضرور کہنا چاہوں گا کہ اگر وہ اپنی زود گوئی پر ذرا سا انکش لگائیں اور اپنے بعض ہلکے اشعار کو قلمزد کرنے کی جرات اپنے اندر پیدا کریں تو بہت اچھے شاعر بن سکتے ہیں۔ کبھی کبھی تو حیرت ہوتی ہے کہ اِدھر گفتگو ہوئی اور اُدھر پوری غزل یا نظم ردیف و قافیہ کے قالب میں ڈھل کر سامنے آ گئی۔ لیکن اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ان کی طبیعت ایسی موزوں ہے کہ وہ خواہی نہ خواہی غزلیں کہتے رہتے ہیں۔ برقی اعظمی کے مزاج اور ان کی طبیعت میں جو شعریت اور موزونیت ہے وہ ان کے والد اور استاد شاعر جناب رحمت علی برق اعظمی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ برق اعظمی اپنے دور کے ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ علی بھائی نے ان کی کلیات شائع کروائی اور دہلی میں اس کا اجرا عمل میں آیا۔ ان کو اپنے والد کے بے شمار اشعار یاد ہیں۔ وہ اپنے

والد کی روایتوں کے امین بھی ہیں اور پاسدار بھی۔ وہ انھیں آگے بھی بڑھا رہے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہیں ہو گا کہ وہ برق اعظمی کی شاعری اور ان کی روایت کے سچے نمائندہ ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں کہ اگر پسر پدر کی روایتوں کو آگے نہ بڑھائے تو اسے اپنے باپ سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔
انٹرنیٹ کے انقلاب نے ان کے اندر بھی انقلابی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ کیسے انھوں نے اتنے کم عرصے میں کمپیوٹر سیکھ لیا اور انٹرنیٹ کے بحر ذخار میں غوطہ بھی لگا لیا۔ آج ہندوستان اور پاکستان اور پوری اردو دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جو انٹرنیٹ میں اس قدر غرق ہو۔ کسی کانفرنس یا مشاعرے میں ہیں۔ ابھی پروگرام چل ہی رہا ہے کہ انھوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اس کی رپورٹ بنائی اور کئی ویب سائٹوں کو پوسٹ کر دی۔ پروگرام ختم ہونے کے بعد لوگوں کو پتہ چلتا ہے کہ ان کی باتیں یا ان کی آواز پوری اردو دنیا میں پہنچ گئی ہے۔ وہ فیس بک کے بھی شہنشاہ ہیں۔ دن بھر میں جانے کتنی بار فیس بک پر اپنا پیج اپ ڈیٹ کرتے ہیں یا غزل اور شعر پوسٹ کرتے رہتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کوئی تصویر پوسٹ کریں گے تو اس کا کیپشن بھی منظوم ہی ہو گا۔ بالخصوص ان تصویروں کا جو ان کو عزیز ہوں۔ علی بھائی بے شمار خوبیوں کے مالک ہیں۔ میں اپنی بات ان کے ہی ایک شعر پر ختم کرتا ہوں:

شعورِ معرفت مضمر ہے برقی خود شناسی میں
"خودی کا راز داں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا"

(یہ مضمون ۲۰۱۵ء میں مرحوم کی زندگی میں لکھا گیا تھا)
ماخذ:
https: //groups.google.com/g/BAZMeQALAM/c/_iMqIAog8Vg/m/xjWjxHSAAgAJ

***

اخلاص و اشتیاق کا پیام، جناب احمد علی برقیؔ کے نام ۔۔ تابشؔ الوری

حضرت برقیؔ نے بھیجا دلنشیں شعروں کا ہار
فکر خیز و معنی انگیز و بلاغت آشکار

لفظ تابندہ نگینوں کی طرح ترشے ہوئے
حسنِ صورت، حسن فن، حسن نظر کے شاہکار

شعر و فن میں کہکشاں احساس کی اتری ہوئی
ندرتِ فن رفعت افکار کے آئینہ دار

قادر الالفاظ پختہ فکر برقیؔ اعظمی
شاعری میں دہلیِ مرحوم کا حسن و وقار

آج تک تاریخ کا جھومر ہے دلی کا ادب
آج تک یہ سر زمیں تہذیب کی سرمایہ دار

ذہن کا بُراقؔ اخلاص و عمل کا آئینہ
دل کے گوشے گوشے میں روشن چراغِ اعتبار

دست بستہ لفظ و معنی سر بسجدہ فکر و فن
منفرد اسلوب، پرواز تخیل، تازہ کار

دفعتاً حسنِ سماعت کے دریچے کھل گئے
اجنبی کو آئی کتنی دور سے دل کی پکار

کلمۂ تحسین ان کا موجب عز و وقار
میں سراپا انکسار و انکسار و انکسار
***

برقیؔ اعظمی کی اردو شاعری --- اسرار احمد رازی قاسمی

سید صباح الدین عبد الرحمن مرحوم سابق ڈائریکٹر دار المصنّفین و مدیر ماہنامہ معارف کے شاگردِ رشید ڈاکٹر احمد علی برقیؔ اعظمی کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ موصوف 1977 سے تا حال دہلی میں مقیم ہیں۔ ان کا تعلق ہندوستان کی مردم خیز سرزمین اعظم گڑھ شہر کے محلہ باز بہادر کے ایک علمی گھرانے سے ہے۔ شاعری کا ذوق و شوق انہیں ورثے میں ملا ہے۔ موصوف کے والد ماجد رحمت الٰہی برقؔ اعظمی مرحوم ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔ ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر رحمت علی اکمل، ڈاکٹر شوکت علی شوکت اعظمی اور برکت علی برکت اعظمی بھی شعر و سخن سے شغف رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر برقی نے اعظم گڑھ سے ابتدائی تعلیم اور شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ سے اردو میں ایم اے کرنے کے بعد دہلی میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے 1996 میں فارسی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور پھر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی میں ملازمت اختیار کر لی۔
ڈاکٹر احمد علی برقیؔ کی شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ایک طرف ان کی شاعری میں موضوعات کا تنوع قارئین و ناظرین کو متوجہ کرتا ہے تو دوسری طرف ان کی شعری خصوصیات اپنی زلف گرہ گیر کا اسیر بنا لیتی ہیں۔ ڈاکٹر برقیؔ اعظمی کے جذبوں کی صداقت، کلام کی شیرینی و ملاحت اور عرض ہنر میں دیدہ و دل کی بصارت جگہ جگہ جلوہ افروز نظر آتی ہے۔ وہ نہ تو مافوق العادت اوہام و تخیلات کے اسیر ہیں اور نہ ہی ماورائیت کے دلدادہ بلکہ زمین پر ننگے پاؤں چل کر زمینی حقیقتوں کا بچشم خود مشاہدہ کرتے ہیں اور ان سے بے باکانہ آنکھیں ملا کر باتیں کرتے ہیں۔ ان کے افکار و خیالات میں قدامت یا باسی پن کا کوئی احساس نہیں ہوتا، تازہ کاری ان کا وصف خاص ہے۔ وہ عصر حاضر کے بیحد ترقی یافتہ سماج میں کلبلاتے درد سے پوری طرح باخبر ہیں۔ وہ امن و سکون کو غارت کرنے والی جنگوں سے اجتناب کی دعوت تو دیتے ہیں لیکن زندگی کی جنگ علم و حکمت سے جیتنے کی وکالت بھی کرتے ہیں احمد علی برقیؔ کی شاعری میں اپنائیت لئے آفاقی احساسات کچھ اس انداز میں جلوہ گر ہوتے ہیں کہ قاری انہیں اپنے دل سے بہت قریب پاتا ہے۔
برقی اعظمی کی شاعری میں وسعت، زبان و بیان کی دلکشی، لہجہ اور طرز ادا کی شیرینی، انداز بیان کی شگفتگی اور فکر و خیال کی رعنائی کے علاوہ لکھنے والوں کے لئے اس میں بہت کچھ ہے، خصوصاً موضوعات کا تنوع محققین کو راغب کرنے کے لئے کافی ہے۔ ان کی شخصیت کی عبقریت پر بہت سے دلائل شاہد عدل ہیں کیونکہ انہوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جن کا اردو ادب کی آبیاری میں بہت بڑا کردار ہے۔ ان کا قلم بے تکان لکھتا ہے، خوب لکھتا ہے اور بہت تفصیل سے لکھتا ہے ان کا اپنا رنگ ہے اپنا زاویہ نگاہ اور الگ شناخت ہے۔ ان کے کلام کی خصوصیات پر کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ تسلسل، تغزل، انداز بیان، روانی الفاظ و ترکیبات کی جیسے ایک جوئے شیریں رواں دواں نظر آتی ہے۔
وہ انتہائی زود گو، خوش گو، بسیار گو شخصیت کے مالک ہیں۔ فکر و فن کی باریکیاں ان کے آگے طفل مکتب نظر آتی ہیں بلا شبہ برقیؔ اعظمی ایک عبقری شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے اپنی مجموعی شاعری سے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ وہ ایک مخصوص دھارے میں بندھنے کے عادی نہیں ہیں بلکہ تنوع ان کی فطرت میں شامل ہے۔ ان کی غزلیں تغزل سے بھر پور اور فنکارانہ حسن کاری سے مزین ہوتی ہیں۔ تراکیب کی خوبصورتی، تشبیہات کی ندرت، الفاظ کا جادوئی در و بست، نرم و خوشنما قافیوں کے موتی، مشکل اضافتوں کے باوجود مصرعوں کی روانی اور ان سب پر مستزاد آپ کی کسر نفسی دلوں کو متاثر کرتی ہے۔ ڈاکٹر برقی اعظمی کی غزلیں نہایت خوبصورت ردیفوں میں طرز ادا کی خوشنمائی کے ساتھ ساتھ انفرادی طرزِ فکر اور جدت پسندی کی بھی نمائندگی کرتی ہیں۔ وہ تجربات کی دلکشی کو کلام کی روح میں سمو کر احساس کی خوشبو جگاتے ہیں اور قاری کے دل و دماغ کو متاثر کر کے جمالیاتی شعور کی آبیاری کرتے ہیں۔ ان کی سخنوری، طبیعت کی موزونیت اور روانی

ہمیشہ ہی قائل کرتی ہے۔ ان کے ان اوصاف کا ہر شخص مداح ہے۔
شعر گوئی ایک بہت خوبصورت فن ہے۔ ایک اچھا شعر یا ایک خوبصورت غزل کہنے کے بعد شاعر کو روحانی فرحت و انبساط اور قلبی راحت و طمانیت کا احساس ہوتا ہے تاہم فی البدیہہ شاعری اکثر شعراء کے لئے مشکل اور ایک بہت کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ در اصل شاعر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو ''فطری شاعر'' اور دوسرے وہ لوگ جو فن شعر و شاعری سے استفادے کے بعد بالقصد یعنی ارادتاً شاعری کرتے ہیں۔ فطری شاعر پیدائشی شاعر ہوتے ہیں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ کسی کمسن یا بالغ شخص نے کہ جس نے فن عروض یا شعر و شاعری کے بارے میں کبھی نہ کچھ پڑھا اور نہ ہی کسی سے سنا لیکن اس کی زبان سے منظوم کلام جاری ہو گیا۔ تاریخ میں ایسے بہت سے شعراء کا نام محفوظ ہے جنہوں نے فن عروض سے استفادے کے بغیر لاجواب شاعری کی اور عصر حاضر میں بھی ایسے بہت سے شعراء موجود ہیں جو فطری شاعر ہیں یعنی وہ بہ تکلف شاعری نہیں کرتے بلکہ شعر خود بخود ان کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے تاہم عہد حاضر میں شعراء کی ایک تیسری قسم بھی پائی جاتی ہے جو نہ فطری شاعر ہیں اور نہ ہی ارادی شاعر ہیں ہم انہیں ''متشاعر'' کے نام سے جانتے ہیں جو بہ تکلف بھی شاعری پر قدرت نہیں رکھتے نتیجتاً انہیں کئی مواقع پر منہ کی کھانی پڑتی ہے۔
برقیؔ اعظمی کی بداہت گوئی ان کی موضوعاتی شاعری میں بہت کھل کر سامنے آئی ہے۔ وہ شاعری جو کسی خاص عنوان یا موضوع کے تحت کی جائے اسے موضوعاتی شاعری کہتے ہیں۔ ادبی شخصیات سے متعلق تعارفی تحریروں میں برقیؔ صاحب نے اپنے ذاتی تاثرات کے علاوہ ان کی خصوصیات، کارناموں اور اختصار کے ساتھ ان کی "حیات و خدمات" پر خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے جو بلاشبہ ان کی قابل قدر خدمت ہے۔ ہماری اہم ترین ادبی شخصیات سے نوجوان نسل کو متعارف کرانے کا یہ نہایت خوبصورت اور دلپذیر انداز ہے جس کی ہند و پاک کے ادبی حلقوں میں پذیرائی کی جانی چاہئے۔ انہوں نے بے شمار موضوعات پر شاعری کی ہے۔ آج ہماری نئی نسل میں فلم، ٹی وی، موبائل اور انٹرنیٹ کے تئیں بڑھتے کریز کی وجہ سے کتابوں کی طرف سے رجحان بالکل ختم ہوتا جا رہا ہے جو علماء اور دانشوروں کے لئے لمحہ فکریہ اور پورے معاشرے کے لئے ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ ڈاکٹر برقیؔ اعظمی کی موضوعاتی شاعری سے متعلق ڈاکٹر غلام شبیر رانا رقمطراز ہیں ''اردو ادب میں موضوعاتی شاعری پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ قلی قطب شاہ سے لے کر ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی تک اردو میں موضوعاتی شاعری نے جو ارتقائی سفر طے کیا ہے اس کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ موضوعاتی شاعری نے اب ایک مضبوط اور مستحکم روایت کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس رجحان کو انجمن پنجاب کی خیال پرور اور فکر انگیز شاعری سے بے پناہ تقویت ملی۔ آقائے اردو مولانا محمد حسین آزاد کی مساعی سے اردو میں موضوعاتی شاعری کو ایک اہم مقام ملا۔ اس کے بعد یہ روایت مسلسل پروان چڑھتی رہی۔ عالمی شہرت کے حامل نامور شاعر محسن بھوپالی کا ایک شعری مجموعہ ''موضوعاتی شاعری'' کے نام سے آج سے پندرہ برس پہلے شائع ہو چکا ہے۔ اس سے یہ صداقت معلوم ہو تی ہے کہ روشن خیال ادیبوں، دانشوروں اور شاعروں نے موضوعاتی شاعری کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ممتاز ادیب، شاعر، دانشور، نقاد اور محقق ڈاکٹر احمد علی برقیؔ اعظمی نے اردو کی موضوعاتی شاعری پر بھر پور توجہ دی ہے۔ ان کی شاعری کے متعدد نمونے میرے سامنے ہیں۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اسے لا زوال بنا دیتے ہیں۔ ان کا اختصاص یہ ہے کہ وہ عظیم تخلیق کاروں کو منظوم خراج تحسین پیش کر کے ان کے بارے میں مثبت شعور و آگہی پروان چڑھانے کی مقدور بھر سعی کرتے ہیں۔ اس میدان میں ان کی مساعی اپنی مثال آپ ہیں۔ جس انداز میں وہ اپنے موضوع پر طبع آزمائی کرتے ہیں اوروں سے وہ تقلیدی طور پر بھی ممکن نہیں۔ اس لا زوال اور ابد آشنا شاعری میں کوئی ان کا شریک اور سہیم دکھائی نہیں دیتا۔ مرزا اسد اللہ خان غالب، میر تقی میر، احمد فراز، پروین شاکر، فیض احمد فیض، سید صادقین نقوی، مظفر وارثی اور متعدد عظیم تخلیق کاروں کو ڈاکٹر احمد علی برقیؔ اعظمی نے جس خلوص اور دردمندی سے خراج تحسین پیش کیا وہ نہ صرف ان کی عظمت فکر کی دلیل ہے بلکہ اس طرح ان کا نام جریدہ عالم پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گیا ہے۔ ان کا اسلوب ان کی ذات ہے۔ وہ انسانی ہمدردی کے بلند ترین منصب پر فائز ہیں۔ کسی کا دکھ درد دیکھ کر وہ تڑپ اٹھتے ہیں اور فی البدیہہ موضوعاتی شاعری کے ذریعے وہ تزکیہ نفس کی متنوع صورتیں تلاش کر کے ید بیضا کا معجزہ دکھاتے ہیں۔ ان کی موضوعاتی شاعری کا تعلق کسی ایک فرد، علاقے یا نظریے سے ہرگز نہیں ان کی شاعری میں جو پیغام ہے اس کی نوعیت آفاقی ہے اور وہ انسانیت کے ساتھ روحانی وابستگی اور قلبی انس کا بر ملا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا یہ اسلوب انھیں ممتاز اور منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ ان کے بار احسان سے اردو داں طبقے کی گردن ہمیشہ خم رہے گی۔ انھوں نے تہذیبی اور ثقافتی اقدار کو اشعار کے قالب میں ڈھال کر وہ معرکہ آرا کارنامہ انجام دیا ہے جو تاریخ ادب میں آب زر سے لکھا جائے گا''
یادِ رفتگاں کے عنوان سے مرحوم ادباء، شعراء و دیگر مختلف ادبی، مذہبی، سیاسی، سماجی، فلمی اور اسپورٹس سے وابستہ شخصیات پر فی البدیہہ شاعری کی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے غالب، میر، نظیر اکبر آبادی، شاد عظیم آبادی، شکیل بدایونی،

محمد رفیع، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، ناصر کاظمی، پروین شاکر کے علاوہ شبلی نعمانی، سر سید، سجاد حیدر یلدرم، رحمت الٰہی برقؔ اعظمی، اسرار الحق مجاز، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، عبدالعزیز یاس چاند پوری، امتیاز علی تاج، ابن صفی، وزیر آغا، ابن انشاء، پروفیسر امیر حسن عابدی، ڈاکٹر قمر رئیس، مقبول فدا حسین اور نواب پٹودی جیسی تمام اہم میدانوں کی قد آور شخصیات پر انہوں نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ
سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے
موصوف کی موضوعاتی نظمیں گلوبل وارمنگ، ماحولیات پولیو، ایڈز، سائنس اور مختلف عالمی دنوں جیسے موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ اس قبیل کی اب تک تحریر کردہ ان کی کاوشوں سے کئی ضخیم مجموعے تیار ہو سکتے ہیں اور یہ گرمیِ تحریر تا دم تحریر جاری ہے۔
موضوعاتی شاعری کے تحت ڈاکٹر احمد علی برقیؔ اعظمی نے ماحولیات، سائنس، بین الاقوامی دنوں، اور آفات ارضی و سماوی وغیرہ پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ جس کا علاحدہ مجموعہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔ 2010 میں جناب اعجاز عبید نے موصوف کی 50 موضوعاتی نظموں کا انتخاب ''برقی شعاعیں'' کے نام سے برقی کتاب کی شکل میں شائع کیا تھا۔ موصوف برقیؔ اعظمی نے ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہنامہ 'سائنس' میں 6 سال تک ہر ماہ مسلسل موضوعاتی نظمیں لکھی ہیں۔ مزید برآں ڈاکٹر برقیؔ اعظمی آج بھی کئی ویب سائٹوں جیسے اردو انجمن، اردو جہاں، اردو گلبن، اردو بندھن، شام سخن، اردو دنیا، آبجو، شعر وسخن وغیرہ سے وابستہ ہیں۔ آج بھی ان کی بداہت گوئی کا یہ عالم ہے کہ وہ فیس بک، اردو لٹریری فورم، محاسن ادب، انحراف ادبی گروپ، فن اور فنکار، جدید ادبی تنقید، محمد معز خان صاحب کی محفل مشاعرہ و دیگر ویب سائٹوں اور ادبی فورموں کی ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہانہ اور سہ ماہی نشستوں میں اپنی فی البدیہہ طرحی، غیر طرحی اور عام تخلیقات شیئر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے فی البدیہہ منظوم تبصرے بھی رقم فرماتے ہیں۔ وہ آج بھی فیس بک پر اور دنیا بھر کی کئی ویب سائٹوں پر فی البدیہہ طرحی اور عام مشاعروں میں پابندی سے شرکت کرتے ہیں۔ انہوں نے درجنوں کتب پر بھی اپنے تاثرات اور تبصروں کو منظوم شکل میں پیش کیا ہے۔ موصوف نے اپنے زیر ترتیب شعری مجموعے '' روحِ سخن'' پر اپنا منظوم پیش لفظ بھی تحریر فرمایا ہے۔ ڈاکٹر برقیؔ اعظمی کی فی البدیہہ شاعری اس وقت اپنے شباب پر ہے۔ فی الحال وہ کئی ویب سائٹوں، انٹر نیٹ کے فورموں اور بلاگوں کے لئے فی البدیہہ لکھ رہے ہیں۔ بداہت گوئی کے لحاظ سے ڈاکٹر برقیؔ اعظمی کا فیس بک پر روز شائع ہونے والا کلام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ کبھی کسی انگریزی نظم کا اردو میں فی البدیہہ ترجمہ پیش کر دیتے ہیں، کبھی کسی مشہور و معروف شخصیت کے انتقال پر ملال پر منظوم تعزیتی پیغام اپ لوڈ کر دیتے ہیں، کبھی کسی صاحب ہنر کو اعزاز و اکرام سے نوازے جانے پر اس کی زندگی کی حصولیابیوں پر فی البدیہہ مختصر سوانح اور کارناموں پر مشتمل پر زور نظم پیش کر دیتے ہیں۔ الغرض سارا دار مدار اپیلنگ پر ہے جو چیز ان کو اپیل کرتی ہے اس کے بارے میں اپنے تاثرات، خیالات، تجزیات فی الفور منظوم صورت میں حاضر کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ رسمی طور پر فیس بک پر احباب اپنی مختلف تخلیقات میں برقیؔ صاحب کو ٹیگ کرتے ہیں جن پر اپنا مختصر تبصرہ بھی وہ اکثر اشعار کی صورت میں پیش کرتے ہیں جوان کی فی البدیہہ شاعری کی ایک بہت بڑی دلیل اور جیتی جاگتی مثال ہے۔
ان سب کے باوجود ان کی گمنامی کی سب سے بڑی وجوہات میں کچھ ان کی گوناگوں مصروفیات اور کچھ مخصوص اداروں کی بے توجہی کار فرما رہی۔ جس کی وجہ سے وہ زمینی سطح پر بہت کم آمیز واقع ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر برقیؔ اعظمی تقریباً 28 سالوں سے آل انڈیا ریڈیو کے شعبہ فارسی سے منسلک ہیں۔ اتنے طاقتور سوشل میڈیا سے طویل وابستگی کے باوجود انہوں نے کبھی بھی اس کا استعمال اپنے ذاتی مقاصد کے لئے نہیں کیا۔ حالانکہ فن شاعری میں ان کے اعلی مقام کے پیش نظر اگر وہ چاہتے تو آج پوری اردو دنیا میں برقیؔ اعظمی کا طوطی بولتا مگر اپنی خود داری، قناعت پسندی اور عزلت پسندی کے پیش نظر وہ گوشۂ گمنامی میں قید رہے اس تلخ حقیقت کے درد کو انہوں نے اپنے ایک شعر میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے

ہوتا زمانہ ساز تو سب جانتے مجھے
کیا خوئے بے نیازی ہے دیوانہ پن مرا

اسی کرب کو ایک جگہ وہ یوں بیان کرتے ہیں

ویب سائٹوں پر لوگ ہیں خوش فہمی کا شکار
نا آشنائے حال ہیں ہمسائے بھی مرے

ایک جگہ یوں فرماتے ہیں

فصیل شہر سے باہر نہیں کسی کو خبر
بہت سے اہل ہنر یوں ہی مر گئے چپ چاپ

یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے نمائش سے قطع نظر عزلت پسندی اور گوشہ گیری کو ترجیح دی حالانکہ وہ چاہتے تو آل انڈیا ریڈیو کی ’’اردو سروس‘‘ اور ’’اردو مجلس‘‘ کی ماہانہ نشستوں میں شریک ہو کر اپنے کلام کے جوہر دکھا سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اتنے پاور فل میڈیا سے وابستگی کے باوجود انہوں نے خود کو پروجیکٹ کرنے سے گریز کیا اور وہ آج بھی اپنی اسی روش پر قائم ہیں۔ اب وقت آگیا ہے اور یہ ہماری صحافتی برادری کی اب مشترکہ ذمہ داری ہے کہ ’’حق بحق دار رسد ‘‘ کے تحت اردو ادب میں ڈاکٹر برقیؔ اعظمی کے مقام کا تعین کیا جائے اور ان کی خدمات کا دل کھول کر اعتراف کیا جائے۔
میدان شعر و سخن میں وہ آج بھی سرگرم سفر ہیں ۔ دہلی کی مقامی ادبی نشستوں میں پابندی سے شریک ہوتے ہیں ۔ فیس پر موجود ان کے البم میں ایک ہزار سے زائد غزلیں اور نظمیں دیکھی جا سکتی ہیں علاوہ ازیں ان کی تخلیقات دیگر ویب سائٹوں، رسائل و اخبارات مثلاً بزم سہارا، راشٹریہ سہارا، نئی دنیا، گواہ حیدر آباد، اردو لنک شکاگو، لمس کی خوشبو حیدر آباد وغیرہ میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتی رہتی ہیں۔ برقیؔ اعظمی کی شاعرانہ خصوصیات و محاسن کا احاطہ اس مختصر مضمون میں نہایت دشوار ہے میں بس اسی پر اکتفا کروں گا کہ
دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار
***

نعت ۔۔۔ عبدالرحمٰن جامیؒ، ترجمہ: احمد علی برقی اعظمی

گُل اَز رَخت آموختَہ نازُک بَدَنی را
بُلبِل ز تو آموختَہ شَیرِیں سُخَنی را

ہر کَس کہ لَبِ لَعل تِرا دِیدَہ بہ دِل گُفت
حقا کہ چہ خوش کَندَہ عَقِیقِ یَمَنی را

خَیّاطِ اَزل دوختہ بَر قامَتِ زیبا
دَر قَد تو اِیں جامۂ سَروِ چَمَنی را

دَر عِشقِ تو دندان شَکَستَہ اَست بہ اُلفَت
تو جامہ رَسانِید اویسؓ قَرَنی را

از جامؔیِ بے چارا رسانید سلامے
بر دَرگہِ دَربارِ رَسُولِ مَدَنی را
**

دَرس آپ سے گُل نے ہے لیا گُل بَدَنی کا
بُلبُل نے سَبَق سِیکھا ہے شِیریں سُخَنی کا

بول اُٹّھا وہ جِس شَخص نے دیکھا لَبِ لَعلیں

کَیا حُسنِ دلآرا ہے عَقِیقِ یَمَنی کا

خَیّاطِ اَزل نے جو سِیا آپ کی خاطِر
تھا جامۂ خوش رَنگ وہ سَروِ چَمَنی کا

اُلفَت میں فِدا کر دئے جو دانت تھے اپنے
دیکھے تو کوئی عِشق اویسِ قَرَنی کا

کَرتا ہے سلام عَرض جو جامیؔ وہ پہنچ جائے
دَربار کُھلا ہو جو رَسُولِ مَدَنی کا
***

غزلیں ۔۔۔ احمد علی برقی اعظمی

امن عالم کی فضا آئیے ہموار کریں
چھوڑ کر بغض و حسد پیار کا اظہار کریں

دیں گے کب تک ہمیں ناکردہ گناہی کی سزا
فرد جرم اپنی بھی کہہ دو کہ وہ تیار کریں

چاہتا کیا ہے بتا مفسد دوراں کھل کر
’’کتنے آنسو ترے صحراؤں کو گلزار کریں‘‘

خانہ دل بھی ہے اللہ کے گھر کی مانند
چھ دسمبر کی طرح اس کو نہ مسمار کریں

ہے کرے کوئی بھرے کوئی کا ہم پر اطلاق
اپنے ہر جرم کا کہتے ہیں کہ اقرار کریں

مسخ کرنے پہ تلے ہیں وہ ہماری تاریخ
اپنی تہذیب پہ اس طرح نہ وہ وار کریں

چھوڑ دیں سرخی اخبار بنانا اس کو
یوں نہ برقی سے زمانے کو وہ بیزار کریں
***

مجھ سے وابستہ ہے گر وابستگی اتنی تو ہو
دوست کا رکھے بھرم وہ دوستی اتنی تو ہو

کوئی ہو ایسا جسے کچھ دیر اپنا کہہ سکیں
''ہو نہ ہو یہ زندگی، یہ زندگی اتنی تو ہو''

دیکھ کر جس کو فدا ہو جائے دل دیوانہ وار
روئے زیبا پر کسی کے دلکشی اتنی تو ہو

ہم نے مانا چار دن کی چاندنی ہے زندگی
ہو سکونِ دل میسر چاندنی اتنی تو ہو

اس قدر تاریک ہے یہ شاہراہِ زندگی
چل سکیں جس میں بخوبی روشنی اتنی تو ہو

دیتا ہے ترکِ تعلق کی وہ دھمکی بار بار
دل کو جو دل سے ملا دے دل لگی اتنی تو ہو

حُسن سیرت میں ہوا کرتا ہے صورت میں نہیں
کم سے کم مہر و وفا کی چاشنی اتنی تو ہو

آدمی کے کام آئے ہے اگر وہ آدمی
آدمیت اُس میں برقی اعظمی اتنی تو ہو
***

میری یہ چشمِ نَم دسمبر میں
نہ کہیں جائے جَم دسمبر میں

اُف یہ جور و ستم دسمبر میں
نہ نکل جائے دم دسمبر میں

جنوری میں گیا تھا یہ کہہ کر
لوٹ آئیں گے ہم دسمبر میں

ہے جو رودادِ ہجرِ گیارہ ماہ
کریں کیسے رقم دسمبر میں

جس کا وعدہ ہے مثلِ وعدۂ حشر
اُس کا ٹوٹا بھرم دسمبر میں

کہیں پہنچا نہ دے یہ سرد ہوا
سوئے ملکِ عدم دسمبر میں

جادۂ شوق طے کریں کیسے
ہو گئے شَل قدم دسمبر میں

جن کے زیرِ نگیں تھا کشورِ دل
بھر رہے ہیں چلم دسمبر میں

ہیں بہت صبر آزما برقیؔ
اُن کے قول و قسم دسمبر میں
***

جشن کی تقریب میں تھا شیشہ و ساغر کھلا
''اس تکلف سے کہ گویا میکدے کا در کھلا''

آتا ہے مجھ کو نظر اک عالمِ محشر کھلا
ہر طرف ہو جیسے ظلم و جور کا منظر کھلا

دیکھنے میں لگ رہا تھا جو بظاہر پارسا
محتسب کے سامنے وہ برسرِ منبر کھلا

کر رہا تھا سب کو امن و صلح کی تلقین جو
عہدِ حاضر کا وہ نکلا ایک فتنہ گر کھلا

اب ہوا معلوم تھا وہ رہزنوں کا سرغنہ
تھا بظاہر دیکھنے میں ایک جو رہبر کھلا

بھر رہا تھا دوستی کا دم جو میری عمر بھر
دشمنِ جاں تھا وہی میرا پری پیکر، کھلا

اپنے دردِ دل کا جس سے کر رہا تھا میں علاج
میرا قبل از وقت قاتل تھا وہ چارہ گر کھلا

لے گیا میری متاعِ شوق اپنے ساتھ وہ
رکھا تھا جس کے لئے ہر وقت اپنا گھر کھلا

میں نے دیکھے ہیں کچھ ایسے بھی سیاسی رہنما
آستیں میں رکھتے ہیں ہر وقت جو خنجر کھلا

اب ہوئی غفلت شعاری اپنی مجھ پر مُنکشف
آج اُن کی شر پسندی کا جو مجھ پر شَر کھلا

ہو گئے جب میرؔ کی دلی سے رخصت ناگہاں
سب پہ برقیؔ اعظمی کا جا کے تب جوہر کھلا
***

(نذر جون ایلیا)

تمہیں مجھ سے محبت ؟ نہیں تو
تو کیا پھر مجھ سے نفرت ہے؟ نہیں تو

تمہیں میری ضرورت ہے نہیں تو
مجھے پانے کی چاہت ہے؟ نہیں تو

جو ظلم و جور مجھ پر ہو رہا ہے
تمہاری یہ شرارت ہے؟ نہیں تو

جو سب سے منھ چھپائے پھر رہا ہوں
صحافت کی کرامت ہے؟ نہیں تو

بہر سو خونچکاں ہے ایک منظر
کوئی اس میں سیاست ہے؟ نہیں تو

سبھی اک دوسرے کو کوستے ہیں
الیکشن ایک لعنت ہے؟ نہیں تو

صحافی کرتے ہیں ریشہ دوانی
صحافت سستی شہرت ہے؟ نہیں تو

سبھی کرتے ہیں اس میں سودے بازی
سیاست اک تجارت ہے؟ نہیں تو

ہیں جامِ زہر سب پینے کو مجبور
تمہیں کیا اس کی عادت ہے؟ نہیں تو

پڑے ہیں پھر یہ کیوں برقی کے پیچھے
عداوت ان کی فطرت ہے؟ نہیں تو
***

مانگے کا اجالا
جھرّیاں --- ابراہیم ایم جُبیرا/ انگریزی سے ترجمہ : عطا صدیقی

شہر کے کاروباری علاقے کے قلب میں واقع یہ گھر ایک اونچا یک منزلہ مکان تھا جس کو یہ فوائد حاصل تھے کہ ایک طرف تو جب مطلع صاف ہوتا شمال میں واقع پہاڑ کا تھوڑا بہت نظارہ کیا جا سکتا تھا اور دوسری طرف جنوب سے اُمسائی ہوا کے وہ جھونکے آ جاتے تھے جن میں سمندری جانوروں کی مخصوص بساند بسی ہوتی تھی۔ تنگ و نیم تاریک گلی میں داخل ہوتے ہی ایک طویل زینہ تھا جو اوپر ایک ڈیوڑھی پر ختم ہوتا تھا جہاں سے پوری گنجان بستی نظر آتی تھی۔ گھر کے مالک کی اُپج کے طفیل ڈیوڑھی کی شہ نشین کے اطراف رنگین چلمنیں پڑی تھیں تاکہ موسم گرما میں تیز اور چلچلاتی دھوپ کو روکا جا سکے اور جب طوفانی موسم آئے تو باد و باراں سے بچا جا سکے۔
تقریباً دس برس سے اس مکان میں شیخ عبدالغفار کا چھوٹا سا کنبہ رستا بستا تھا۔ بوڑھا شیخ اپنے سبز عمامے، گلابی عبا، خاکی چپّلوں اور سونے کی موٹھ والی چھڑی سے مزیّن، یہاں عیش و آرام والی قابلِ رشک زندگی گزار رہا تھا۔ اُس کو اس بات پر فخر تھا کہ وہ ایک محنتی آدمی ہے جس نے اپنی زندگی ایک قلّاش کی طرح شروع کی تھی۔ جب وہ اپنے پرانے وطن کو ترک کر کے یہاں آیا تھا تو اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی، اور اب انجام کار اس نے اتنی دولت جمع کر لی تھی کہ تمام عمر ختم نہ ہو۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ شیخ عبدالغفار جس شے کو چھُو دے وہ فوراً سونا بن جائے۔ اور حقیقت بھی یہی تھی کہ بوڑھے شیخ سے زیادہ مصروف کوئی نہ ہو گا۔ دن بھر وہ گھر سے باہر ہی رہتا اور اپنی جواہرات کی دکان اور دیگر چھوٹے موٹے کاروبار کی دیکھ بھال کرتا اور شام کو گھر لوٹ کر شراب کی چسکی لگاتا اور اپنی رقم گنتا۔ اور ترنگ میں آتا تو اپنے دقیانوسی گراموفون سے گانے سنتا یا پھر اپنی بیوی کی گرم آغوش سے لطف اندوز ہوتا۔ گھر میں اس کی بیگم کی دُسراہٹ کے لیے ایک دور پرے کی سالی بھی رہتی تھی۔ اُس کا نام صوفیہ تھا۔ صوفیہ ایک بن بیاہی عورت تھی جو چالیس کے پیٹے میں تھی اور جس کا پانچ سال پرانا گٹھیا کا مرض اس کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کر رہا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اس کا برتاؤ صوفیہ کے ساتھ اتنا ہی ظالمانہ تھا جتنا اُس کے ناکام معاشقے کا۔ تیس برس سے ذرا زیادہ عمر کی زہرہ صوفیہ سے زیادہ خوش نصیب تھی۔ لا ولد ہونے کے باوجود وہ شیخ کی بیوی ہونے کے ناتے زندگی کے مزے لُوٹ رہی تھی۔ وہ اس تصور میں مگن رہتی تھی کہ پختہ سِن ہو جانے کے باوجود اس نے اپنی طراوت کو برقرار رکھا ہوا تھا جس پر نئی نسل انگاروں پر لوٹتی تھی۔ رہی اس کے چہرے کی بناوٹ تو اب بھی اس کی ناک کا بانسہ اونچا اُٹھا ہوا تھا۔ اس کی گہری آنکھوں کو گھنی بھنووں نے اور بھی نمایاں کر رکھا تھا۔
صوفیہ اور زہرہ دور کے رشتے سے خالہ زاد بہنیں تھیں۔ جب ان کی ملاقات ہوئی تھی دونوں ہی بڑی ہو چکی تھیں۔ پرانے وطن میں والدین کی وفات ہو جانے کے بعد صوفیہ کو اس کے ایک ماموں نے پالا تھا۔ چند برس بعد وہ ماموں بھی کسی انجانے مرض میں اللہ کو پیارا ہو گیا تو اس کو اپنی خالہ کے ساتھ اس نئے آزاد ملک میں رہنا پڑا، اس انوکھے 'فری فین' میں۔ شروع میں ہی چھوٹی چھوٹی بد گمانیوں سے ان دونوں کے دلوں میں بال پڑ چکے تھے لیکن زہرہ کے والدین کی موت کے بعد یہ ان دونوں کی ضرورت تھی کہ وہ ایک دوسرے کی رفاقت سے اس کی صبر آزما ناخوشگواری کے باوجود چمٹی رہیں۔ اگر اب ان کے دلوں میں حسد کی تلخی تھی بھی تو انھوں نے کمال عیاری سے اس پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ یہ بغض کبھی کبھار غیر شعوری طور پر ظاہر ہو جاتا لیکن اس وقت تک وہ اتنا تشویش ناک نہیں ہوا تھا کہ شیخ کے گھر کے سکون کو درہم برہم کر دیتا۔
طبیعت جولانی پر ہوتی تو دونوں خالہ زاد بہنیں ڈیوڑھی کی شہ نشین میں بیٹھ کر سستاتیں اور خوش گپّیوں میں وقت گزارتیں۔ جب یوں ہوتا تو صوفیہ آرام کرسی پر بیٹھ کر کشیدہ کاری کرتی۔ زہرہ کبھی سوزن کاری میں دیدہ ریزی نہ کرتی بلکہ جھولنے والی کرسی میں بیٹھ کر اپنی خلیری بہن کو دیکھتی اور اُس سے باتیں کر کے خوش ہوتی۔ کبھی کبھار وہ اپنے جُوڑوں کو بنا سنوار کر اپنی کَسی چولیوں میں ہی اپنی گات کو ابھارتیں اور فرمائشی قہقہے لگا کر لوٹ پوٹ ہو جاتیں۔ ان کی یہ پُر اسرار حرکات، جن کا راز انھوں نے چالاکی سے اپنے تک رکھا ہوا تھا، دراصل ان کی اپنی پڑوسنوں کی نقّالی ہوتی تھی کہ وہ کس طرح اٹھتی بیٹھتی تھیں، ان کی روزمرّہ کی عادتیں اور یہ کہ ان کے شوہر ان کی کیسی گت بناتے تھے۔
"ذرا سوچو تو" صوفیہ ایک سہ پہر پڑوسیوں کے اس ایک سے اُکتا دینے والے موضوع کو چھوڑ کر بولی۔ "اور کیا، ذرا سوچو تو..." اُس نے کاڑھنے سے ہاتھ روک کر کہا۔ "کسی نے کبھی کاہے کو سوچا ہو گا کہ شیخ تمھارا ہو جائے گا اور تم یوں ٹھاٹ کرو گی؟" مگر جی ہی جی میں اُس نے یوں کہا: جو کچھ تمھارا یہاں ہے اس پر میرا بھی پورا حق بنتا ہے۔ میں تم سے عمر میں کافی بڑی ہوں۔ بخدا ایک وقت تھا کہ تمھارا میاں تھوڑا بہت میرے قبضے میں بھی تھا۔ وہ تو تمھاری بے حیائی نے...
زہرہ نے اپنی خالہ زاد بہن پر نظر ڈالی تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "اے لو، ہر ایک کو اس بات کی امید تھی۔ یاد نہیں جب شیخ محمود نے میرا ہاتھ دیکھا تھا تو کہا تھا: زہرہ، اپنی آنے والی بختاوری پر اللہ کا شکر ادا کرو۔ یہ لکیریں بتاتی ہیں..."
"ارے وہ کھوسٹ نجومی... اور یاد ہے اُس نے مجھ سے کیا کہا تھا؟ کیا وہ بد فال نہیں تھی؟ میں نے تو اُس کا ٹینٹوا دبا دیا

ہوتا...'' اُس لمحے صوفیہ کے پتلے حسّاس جبڑے کپکپاتے ہوے یوں بھنچ گئے گویا وہ اپنی کسی اندرونی تکلیف کو دبا رہی ہو۔
''اوہو صوفیہ، اب اُس پر اتنا غصّہ تو نہ کرو۔ اُس نے تو ایک سچی بات کی پیش گوئی کی تھی۔''
صوفیہ نے اپنی خالہ زاد بہن کی طرف حیرت سے دیکھا اور جل کر بولی، ''سچی بات! حضور کے روضۂ پاک کی قسم، ذرا سوچو اُس نے کہا کیا تھا؟ صوفیہ، تم اب کسی آدمی کا دامن کیوں نہیں تھام لیتیں؟ اگر تم نے یہ نہ کیا تو تمھاری جان کی خیر ہو، تمھاری شادی پھر کبھی نہ ہو سکے گی۔''
زہرہ دل کھول کر اتنا ہنسی کہ اُس کے آنسو رواں ہو گئے۔ مگر اپنی خالہ زاد بہن کے چہرے پر کرب دیکھ کر اُسے فوراً احساس ہوا کہ اس ہنسی سے اُس کی خالہ زاد بہن کو اذیت پہنچی ہے تو اُس نے دم سادھ لیا۔
اُس نے اپنی انگیا کے اندر سے رومال نکالا اور اپنی آنکھیں پونچھنے لگی۔ نتیجتاً کچھ وقت کے لیے سکوت چھا گیا جس میں شہر کے کاروباری علاقے کی بھنبھناہٹ در آئی۔ سورج کی شعاعوں نے فرش پر روپہلی پٹی بنا دی تھی۔ زہرہ رنگین چلمنوں میں سے ایک کو گرانے کے لیے اٹھی اور پھر بیٹھ کر اپنی خالہ زاد بہن کو اپنا کام کرتے دیکھتی رہی۔
کچھ دیر کے بعد ہی زہرہ گفتگو کے ٹوٹے دھاگے کو پکڑ سکی۔ ''یہ کام کب تک نبیڑ لو گی؟'' اور جی ہی جی میں یوں کہا: دُکھیا بڑی بی، ایسی باتیں دل پر کیوں لیتی ہو؟
صوفیہ بولی، ''اب ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ شاید ایک آدھ ہفتے میں نبٹ جائے۔'' اس نے سامان ایک طرف کیا اور اپنی انگلیاں چٹخانے لگی۔ پہلے اس نے کاروباری اور رہائشی عمارتوں کو تکا اور پھر دور دراز نیلے پہاڑ کی جانب رُخ کر لیا تاکہ اپنی تھکی نگاہوں کو چین دے سکے۔ زہرہ نے اپنی پنکھیا اٹھا لی اور جھلنے لگی۔ دونوں پھر گم سم ہو گئیں۔
اس مختصر سے پُر سکون لمحے میں صوفیہ تصور ہی تصور میں اپنی جوانی کے ہنگامہ خیز دنوں کے گذرے واقعات کو سلسلہ وار چھوٹی چھوٹی تصاویر کی صورت میں دیکھنے لگی۔ تلخ اور شیریں پریشان کن احساسات اُس کے ذہن میں روانی سے گزرنے لگے، اوّل اوّل تو بالکل اُس چڑیا کے بچے کی طرح پھڑپھڑا کر جو اڑان کے لیے پر تول رہا ہو، اور پھر تو انھوں نے بپھرے تاریک پانی کے سیلاب کی طرح اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اُسے شیخ سے اپنا معاشقہ یاد آیا جو اُس وقت ادھیڑ عمر تھا۔ ایک مرتبہ وہ مغرب کی نماز کے بعد کسی طرح پرانی مسجد سے چپ چاپ نکل آئے تھے اور پھر چند دنوں کے چوری چھپے چاؤ چونچلوں کے بعد شیخ نے کم سن زہرہ کا رشتہ مانگنے کا فیصلہ کر لیا۔ آخر کیوں؟ کیا اس کا سبب یہ تھا کہ زہرہ زیادہ قبول صورت اور ہری بھری تھی جبکہ وہ یعنی صوفیہ... اُس کے گٹھیا مارے پیروں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں اور وہ اپنے دُکھتے پیروں کو سہلانے کے لیے جھکی۔ یہ کام اُس نے بالکل بے نیازی سے کیا۔ دراصل اس نے خود اپنے دل میں اسے بے نیازی ہی گردانا ___ اپنی زندگی، اپنی صحت، اپنے عشق اور اپنی شادی سے بے نیازی۔ اچانک اس کے اندر ہوا سے دہکائے ہوے شعلے کی طرح حسد کی چنگاری اُڑی لیکن اس نے تحمل سے بظاہر اپنے پُر سکون وقار کو برقرار رکھ کر اُسے قابو میں کر لیا۔
''مجھے حیرت ہوتی ہے زہرہ، کہ شیخ عبدالغفار اب تک تم سے کیوں چپکا ہوا ہے؟ تم ہو نِپُوتی، اور مسلمانوں کے رواج سے اُسے دوسری کر لینا چاہیے۔''
''وہ نہیں کر سکتے'' زہرہ نے اتنی سُرعت سے جواب داغا کہ بجلی کے کڑاکے کی طرح اس نے صوفیہ کو حواس باختہ کر دیا۔
''کیوں؟''
''میرے اب بھی وہی چم خم ہیں۔ کبھی تم نے دیکھا ہوتا کہ وہ کیسی نظروں سے مجھے سراہتے ہیں، اور اگر حقیقت یوں نہ ہوتی...''
''اچھا تو اب بھی وہ تم سے جی لُبھاتا ہے! اری زہرہ، اب ایسی بھولپن کی بات تو نہ کرو۔ دس برس تمھارے ساتھ یوں گزار کر کیا وہ اُوبھ نہیں جائے گا؟ بغیر کسی دوسری عورت کی تلاش کے رہ جائے گا جو اُس کو...''
''کیا بک رہی ہو صوفیہ!''
''میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ شیخ کو اپنی اولاد کا ارمان ہو گا اور وہ اس کو بھلا کس طرح مل سکے گی؟''
''خیر۔ اُس نے ابھی تک تو یہ بات نکالی نہیں۔ علاوہ اس کے، اُس جیسی عمر کے آدمی کو مجھ جیسی بیوی پا کر چین سے بیٹھ جانا چاہیے۔ میں تو آخر شادی کے وقت بہت کم سن تھی اور دیکھنے میں اب بھی میں کوئی بُری نہیں ہوں۔''
پھر خاموشی۔ اَور خاموشی۔ دونوں خلیری بہنیں اپنے اپنے خیالات میں گم نظر آتی تھیں۔ بازار کی فٹ پاتھ پر اخبار فروش لونڈے گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے تھے۔ پڑوس کی دھوبنوں نے اپنی بے ہودہ غیبتیں کرتے ہوے، صابن گھُلا مَیلا پانی کھڑکیوں سے باہر فرش پر پھینکا۔
''تم نے جو یہ کہا زہرہ کہ تم بہت چھوٹی تھیں، مگر اب تو نہیں ہو۔ کیا تم نے اِن دنوں اپنے چہرے پر نظر نہیں ڈالی؟ تمھارے دہانے اور آنکھوں کے آس پاس ہلکی ہلکی جھرّیاں پڑ رہی ہیں۔''

’’کیا واقعی؟‘‘
’’اچھا ہو اگر اندر جا کر خود کو آئینے میں دیکھ لو۔‘‘
’’ہوں گی، ہوں گی۔ پروا نہیں۔ میں نے تو جی بھرپور زندگی گزار لی۔‘‘
تو گویا اب اُس کے چہرہ پر جھرّیاں پڑ گئی تھیں، اور نظر بھی آئیں تو سب کو چھوڑ کر صوفیہ کو، اور پھر اس نے جتا بھی دیا۔ اس حرکت نے زہرہ کے نازک مزاج کو کبیدہ کر دیا لیکن اُس نے دوسری عورت کی کہی بات کا اثر خود پر یوں ہی سا ظاہر کیا۔ بات کو مزید تلخ بنا دینے کے لیے صوفیہ نے مندرجہ ذیل اعلان داغ دیا۔
’’سوچو تو بھلا تمھاری زندگی کتنی مختلف ہوتی جو کہیں تم نے احمد الجناح سے شادی کر لی ہوتی۔‘‘ اور جی ہی جی میں اس نے یوں سوچا: اور میں شیخ کو پا سکتی اگر وہ تمھاری ہر وقت کی مسکراہٹ اور کھلکھلاہٹ پر سِڑی نہ ہو گیا ہوتا۔ دیکھو زہرہ، تم نے میرے منھ میں آیا ہوا تَر نوالہ اُچک لیا۔
’’ارے وہ لفنگا! میری نظر میں تو وہ ایک جانگلو چاپلوس لینڈی کتا تھا۔‘‘
’’ہائے کیوں زہرہ! وہ تو جوان تھا، سجیلا تھا۔ بخدا وہ تو تم سے شادی کر لیتا اگر شیخ نے تمھارے ابّا کو بہت سارا چڑھاوا نہ پیش کیا ہوتا۔‘‘ یہ کہتے ہوے اس کے دل میں تاراج کر دینے والی خواہشات اُبل پڑیں۔
’’میں مانتی ہوں مجھے احمد سے لگاؤ تھا، اور جیسا تم نے کہا وہ نوجوان بھی تھا، کڑیل بھی تھا۔ پر بی، کوئی خالی خولی محبت اور جوانی پر گزارا نہیں کر سکتا۔ آخر کل کا آسرا سب سے پہلے چاہیے۔ اس میں شک نہیں، میرا اُس کے ساتھ جی بڑا لگتا تھا۔‘‘
’’یاد ہے کتنے جگ بیت گئے؟‘‘
’’دنوں کی گنتی میں چھوڑ چکی۔‘‘
’’پتا نہیں اب وہ کہاں ہے۔ جب سے یہاں سے گیا ہے اس کا کوئی اتا پتا ہی نہیں۔‘‘
’’پرانے وطن لوٹ گیا ہو گا۔ یا ہو سکتا ہے کہ سنگاپور کے عرب کوچوں میں کہیں مارا مارا پھر رہا ہو۔ کون جانے؟ بے چارہ! دل اُس کا ضرور ٹوٹ گیا ہو گا۔‘‘
’’یاد ہے، تب تم بہت بے چین رہتی تھیں؟‘‘
’’رہتی تو تھی، پر تم تو جانتی ہو جب ابّا اماں حیات تھے تو حالات کیا تھے۔ انھوں نے کہا: شیخ سے شادی کر لو اور آسودگی سے گزارو۔ یوں تمھارا مستقبل محفوظ ہے۔‘‘
اپنی افتادِ طبع کے سبب صوفیہ اپنی پراسرار ناقابلِ اندازہ شخصیت کی بغل میں دغا کی چھری چھپائے رکھتی تھی، جس کو اس نے اِس وقت اپنی خلیری بہن کو ایک اندرونی کچوکا لگانے کے لیے استعمال کیا۔ وہ بولی، ’’کیوں جی، شادی سے پہلے کسی آدمی سے آشنائی کے بارے میں شیخ نے کبھی تم سے کچھ بھی نہیں پوچھا؟‘‘
’’احمق مت بنو۔ لے دے کے یہی ذکر تو رہ گیا تھا جیسے۔‘‘
’’اب ناراض مت ہو زہرہ۔ میں تو بس یوں ہی جاننا چاہ رہی تھی۔‘‘
’’یقین جانو کبھی نہیں پوچھا۔ مجھے اس سے ایسی امید بھی نہیں۔ بھلا اس کا اس معاملے سے کیا واسطہ۔‘‘
’’اے بی کم از کم ...‘‘
’’تب میں اس کی بیوی کب تھی!‘‘
’’پر کم از کم تمھیں چاہیے تھا کہ اُسے بتا دیتیں۔ اپنے شوہر کو اندھیرے میں رکھنا اچھا نہیں ہوتا۔ یہ تو کلام پاک میں بھی لکھا ہے۔‘‘ اور جی ہی جی میں اُس نے یوں سوچا: میں تو اُس کو بتا سکتی تھی کہ میری زندگی میں بس وہی ایک مرد آیا تھا، اور جو میں نے خود کو اس کے سپرد کر دیا تھا تو اس کی وجہ میرا یہ خیال تھا کہ...
’’بس اب ان بیتی باتوں کو جانے دو صوفیہ۔‘‘
’’اچھا تم کو دکھ ہوتا ہے تو جانے دو۔‘‘
رات شیخ اور اس کی بیوی معمول سے کچھ پہلے ہی سونے کے لیے آرام گاہ میں چلے گئے لیکن وہ فوراً ہی سونے کے لیے نہیں لیٹے۔ شیخ تو حسبِ عادت نشہ پانی اور اپنے دقیانوسی گراموفون کے گانوں میں مگن ہو گیا جبکہ زہرہ ایک سبز سوفے پر بیٹھ کر خود کو اپنے شوہر کی دلچسپیوں میں شریک ظاہر کرنے لگی۔ دقیانوسی عربی گانوں سے اس کی طبیعت اُلجھتی تھی۔ دراصل وہ بیزار تھی اور اپنی جگہ بیٹھی پہلو بدلتی رہی اور دعا کرتی رہی کہ شیخ جلد ہی اپنے اس خنّاس سے فارغ ہو جائے اور سونے لیٹے، لیکن اس میں اتنی ہمّت نہیں تھی کہ وہ اپنے شوہر پر یہ بات ظاہر کر دے۔ بارے اسے نجات مل ہی گئی۔ اُس شخص نے اپنا عمامہ اتارا اور سونے لیٹ گیا۔ گھڑیاں کی ٹک ٹک کے علاوہ اس لمحے مکمل خاموشی تھی۔
دوسرے کمرے میں صوفیہ سوفے پر بیٹھی کاڑھنے میں مصروف تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنے کام پر توجہ نہیں دے پا رہی۔ جماہی روکنے کے لیے اس نے ہاتھ اٹھایا۔ ایک آدھ بار اس نے کان کھڑے کیے تاکہ خفیف سے خفیف سرگوشی بھی جو

پاس کے کمرے میں ہو سن سکے۔ چندے اُس نے ہنسی اور دھیمی سرگوشیاں سنیں اور تھوڑی ہی دیر بعد اپنی خلیری بہن پر دبے دبے قہقہوں کا دورہ پڑتے سنا۔ احمقو! بن بیاہی عورت نے سوچا۔ احمق مزا لوٹ رہے ہیں۔ آخر اس شیخ کو ہوش کیوں نہیں آتا؟

چند ہی دنوں میں اپنی خالہ زاد بہن کی اٹھتے بیٹھتے کی لگاتار اشارتوں سے تنگ آ کر زہرہ اپنی زندگی کے بارے میں متفکر رہنے لگی۔ ایک صبح ناشتے کی میز پر اس نے محسوس کیا کہ ماحول میں کھنچاؤ ہے، بالکل اُس تنے ہوے تار کی مانند جو کسی بھی لمحے ٹوٹ سکتا ہو۔ ہر کوئی دوسرے سے نظریں چرا رہا تھا۔ ان کی گفتگو مختصر اور بے جان تھی۔ شیخ کے روزمرّہ کے چٹکلے بھی دونوں عورتوں پر اثر نہیں کر رہے تھے اور اس کی ساری خوش مذاقی گویا سامنے کی دیواروں سے سر پھوڑنے کے لیے تھی۔ شیخ نے ان کو ہنسانے کے لیے جو کچھ بھی کیا پھُس ہو کر رہ گیا۔ شیخ نے فوراً اس عجیب تبدیلی کو بھانپ لیا جس نے اسے پریشان کر دیا۔ اس کی کھلی بانچھیں سکڑ گئیں اور ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں اور اُس نے اپنے باریش دہانے تک اٹھی ہوئی کافی کی پیالی پھر میز پر رکھ دی اور اپنی بیوی سے پوچھا، ''کیا بات ہے میری ننّھی؟''

زہرہ کا سر بھاری ہو رہا تھا، جو ایک جھوٹا بہانہ تھا اور وہ یہ جانتی تھی۔ شیدائی اور شفیق شیخ نے تاسّف کے اظہار میں اپنی زبان ٹٹخائی اور اپنا عمامہ پوش سر افسوس میں ہلایا، اور بیوی سے کہا کہ وہ فوراً جا کر لیٹ جائے۔ اس نے وعدہ کیا کہ اپنی جواہرات کی دکان جاتے ہوے جیسے ہی راستے میں دوافروش کی دکان پڑے گی وہ اس کی دوائی بھجوا دے گا۔ ''اور صوفیہ'' شیخ نے تنبیہ کی، ''خیال رہے جیسے ہی دوا پہنچے تمھاری بہن دوا کھا لے۔'' صوفیہ نے پھیکی مسکراہٹ سے اقرار میں سر ہلا دیا مگر بولی نہیں۔

شیخ کے جانے کے بعد دونوں خلیری بہنیں ایک دوسرے سے کٹی کٹی رہیں۔ ان دونوں میں کبھی جوتم پیزار کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس وقت دونوں کا جی نہ چاہا کہ خوش گپیوں سے دل بہلائیں۔ جب اسپرین کی ٹکیاں آ گئیں تو صوفیہ نے بغیر کچھ کہے اپنی خلیری بہن کو پکڑا دیں، جنھیں زہرہ نے چپ چاپ لے لیا، ڈرائنگ روم پار کیا، ٹکیاں ٹائلٹ میں پھینکیں اور بیڈروم میں گھس گئی۔

اپنے کمرے کی تنہائی میں زہرہ ان باتوں سے جو ان دونوں کے درمیان ڈیوڑھی میں بیٹھ کر ہوتی رہی تھیں، اور اب اِس وقت کی اس انوکھی خاموشی سے اور زیادہ اُلجھنے لگی۔ جب اُس نے آئینے میں خود پر نظر ڈالی تو صاف ظاہر تھا کہ وہ اب اتنی جوان نہیں رہی جتنی پہلے ہوا کرتی تھی۔ ہائے، ماہ و سال کے تاریک سائے اس کی سمت بڑھنا شروع ہو گئے تھے۔ اس کے منھ کے کناروں پر اور آنکھوں کے گرد باریک باریک جھرّیاں تھیں۔ یہ تو پھر بھی زمانے کی ڈالی ہوئی جسمانی جھرّیاں تھیں مگر وہ جو درونِ دل تھیں؟ اس کی سوچ گہرائی کی سمت چل نکلی۔ اس کا دھیان اپنی جوانی کی طرف لوٹنے لگا اور اس نے اپنی بیتی زندگی کو یاد کیا۔ احمد الجناح بدّھو تھا۔ وہ چمپت کیوں ہو گیا؟ بڑا ٹوٹ کر محبت کرنے والا تھا وہ۔ پھر اسے دوسرا خیال آیا کہ آیا وہ اس کمینے سے اپنے مراسم کو ہمیشہ کے لیے پوشیدہ رکھ سکتی تھی؟ جو وہ اپنے شوہر کو بتا دے تو کیا ہو گا؟ آخر شیخ نے اسے بہت آسائشیں دی تھیں، کیا اس کا حق نہیں کہ اُسے معلوم ہو؟ بالفرض اگر اس کی خالہ زاد بہن اس کی زندگی برباد کر دینے کے لیے شیخ کو بتا دے... لیکن نہیں، صوفیہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گی۔ آخرکار اس کا اثر معاشی طور پر اُس کی زندگی پر بھی پڑے گا۔

جوں جوں دن گزرتے گئے زہرہ کی زندگی نے ایک نیا پریشان کن ڈھب اختیار کیا۔ اس نے صوفیہ کے ساتھ ڈیوڑھی میں بیٹھنا چھوڑ دیا، مبادا وہی ذکر پھر نکل آئے۔ اپنے کمرے میں ہوتی تو اکثر وہ آئینہ دیکھا کرتی اور اپنے چہرے کی معمولی سی تبدیلیوں کو دیکھ کر حیرت کرتی۔ وہ جانتی تھی کہ ہلکی جھرّیاں دن بدن زیادہ گہری ہوتی جائیں گی۔ بہرحال، وہ سب اس کے لیے اتنی تکلیف دہ نہیں تھیں جتنی زندگی کی دین اندرونی گہری سیاہ جھرّیاں جن کا تصوّر ہی اس کے اندر ایسی سرسراہٹ پیدا کر دیتا جو ساحل سے ٹکرانے والی موجوں کی طرح بڑھتی چلی جاتی اور اس کے پورے جسم پر چھا جاتی۔ وہ رہ رہ کر دل میں سوچتی کہ اُس کی ان اندرونی جھرّیوں پر دنیا کی نظر نہیں پڑنی چاہیے۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ انھیں اپنے ساتھ ہی اپنی قبر میں لے جائے گی۔

کمرے کے اُس طرف صوفیہ بھی ان ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی اور بے کل ہو رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ زندگی کی ان اندرونی تاریک جھرّیوں کو مٹاتے مٹاتے تو پوری عمر بیت جائے گی۔ یہ اس کی سادگی بلکہ حماقت ہی تھی کہ اُس نے اتنا نازک موضوع اپنی خلیری بہن کے سامنے چھیڑا، یہ جانتے ہوے کہ وہ خود بھی عیب سے پاک اور ملامت سے مبرّا نہیں۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ میاں بیوی نے اپنے راز و نیاز میں کبھی اُس کا ذکر ہی نہ کیا ہو؟ کم از کم اُن کے کسی عمل نے تو ایسا ظاہر نہیں کیا تھا کہ زہرہ کو گھر کے مالک اور صوفیہ کے گذرے تعلق کا مکمل علم ہو۔ یا شاید وہ بھلی عورت یہ سوچ کر کہ اُس کا کوئی سہارا نہیں، اُس کا لحاظ اور مروّت کرتی ہو۔ یا شاید وہ شروع سے ہی سب کچھ جانتی ہو... یہ زہرہ بعض وقت ایک دم بجھ کیوں جاتی تھی؟ لا تعلّق کیوں ہو جاتی تھی؟ یہ سب خیالات گڈمڈ ہونے کے باعث الجھے ہوے خاردار تاروں کی مانند اُس

کی کنپٹیوں کو پھاڑ کر نکل آنے کو ہوتے اور انجام کار وہ خود رحمی پر اُتر آتی۔ اسی باعث اُن کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا ہو گئی تھی جس کا سبب خود بوڑھے شیخ کے سوا کوئی نہ تھا۔ صوفیہ نے تلخی سے سوچا کہ جب تک شیخ ختم نہیں ہو جاتا اُس کی یہ خفیہ بے تعلّقی جاری رہے گی اور اُن کی روزمرّہ زندگی کو اندر ہی اندر گھُن کی طرح چاٹتی رہے گی۔
مگر ایک ہفتے بعد ہی زہرہ کو غیر متوقع حیرت سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک سہانی صبح جب وہ اپنے کمرے سے باہر نکلی تو اُس نے محسوس کیا کہ ان کی وہ دل لگی اور چہلیں جو اُنھوں نے اُس دن کی کشیدگی کے بعد دوبارہ شروع کر دی تھیں یکلخت معدوم ہو گئی تھیں۔ یوں لگا جیسے وہ نازک انسانی رشتہ جس سے اُن دونوں کی زندگیاں منسلک تھیں، حالات کے پنجوں نے کھسوٹ لیا ہو، کچھ اس طرح کہ اب جو تھوڑا بہت تعلّق باقی رہ گیا تو اُس کا تسمہ اتنا کمزور تھا کہ ایک جھٹکا بھی برداشت نہ کر سکتا۔ دونوں خالہ زاد بہنیں یہ جانتی تھیں کہ بے کیف زندگی کی تلخی ان کے رگ و پے میں اترتی جا رہی ہے جس سے کوئی چھٹکارا نہیں۔ زہرہ اس بات کی زیادہ قائل ہو گئی، خاص طور پر جب اُس نے اپنی خلیری بہن کو کاڑھنے سے ہاتھ روک کر گم سم بیٹھے دیکھا۔ وہ ایک ایسے شہید کی طرح جس نے ذلّت اور موت کو قبول کر لیا ہو، سر نیہوڑائے بیٹھی تھی۔ یہ دیکھ کر اس وقت زہرہ کا دل بہت دُکھا۔ وہ صوفیہ سے پوچھنے ہی والی تھی کہ آخر اُسے کیا غم ہے، لیکن اُس کے کم چکنے چہرہ پر بہتے ہوے آنسوؤں نے اسے پوچھنے سے روک دیا۔ چناں چہ زہرہ ایک ایسے پُر سکون وقار کے ساتھ جو گھر کی مالکن کو زیب دیتا ہے، چپ چاپ ڈیوڑھی میں چلی گئی جہاں دھوپ نے فرش پر روپہلی پٹی بنا دی تھی۔ اُس نے ایک رنگین چلمن بہت احتیاط اور نزاکت سے یوں گرائی جیسے اس کی ذرا سی درشت حرکت اُس کی زندگی تباہ کر دیتی، اور جھولنے والی کرسی میں بیٹھ گئی۔ اُس نے سوچا یوں وہ دونوں کی زندگیوں کی اُن اندرونی تاریک جھرّیوں کے بارے میں ایک معقول تناظر میں غور کر سکتی تھی اور پوری طرح جان سکتی تھی کہ انھوں نے اس کی خلیری بہن اور خود اس کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ آخر کیوں کیا۔
***

اک دفعہ میں کسی گنجان نگر سے گزرا۔۔!! ۔۔ والٹ وھٹ مین/ عبد الرؤف
انتخاب و ٹائپنگ : احمد بلال

اک دفعہ میں کسی گنجان نگر سے گزرا
ایک رونق تھی عیاں شہر کے بام و در سے
فن تعمیر کی تابندہ مثالیں دیکھیں
شہر کی رسم و روایات بھی تھیں پیش نظر
مری آنکھوں نے اس انداز سے سب کچھ دیکھا
کہ میرے ذہن میں باقی رہے ہر چیز کا نقش
تاکہ اس نقش سے کچھ کام لوں آگے چل کر

اب جو کرتا ہوں نظر ذہن کے تہہ خانوں پر
تو وہاں نقش کسی چیز کا موجود نہیں
شہر کی یاد دھندلکے میں یوں پیوست ہوئی
جیسے بھولا ہوا قصہ ہو، یا گم گشتہ خیال
گو مرے ذہن کو اس شہر سے کچھ ربط نہیں
بات اک ایسی ہے جو دل سے نکلتی ہی نہیں
اور وہ بات جو اس شہر سے وابستہ ہے

یاد آتا ہے اسی شہر کی اک عورت نے
روک رکھا تھا مجھے کیونکہ محبت تھی اسے
شہر کو بھول گیا، اس کو نہ میں بھول سکا
دن گزرتے گئے اور جذبہ باہم کی بنا
پختہ تر ہوتی گئی ہر سحر و شام کے ساتھ
قرب باہم کے لئے کوئی رکاوٹ نہ رہی

گم ہوئی جاتی ہے گو حافظے سے شہر کی بات
غرق تھی جذبہ الفت میں مگر وہ عورت
جو مری ذات سے پیوستہ ہوئی جاتی تھی
ہم کبھی شوق کے جذبے میں بہک جاتے تھے
ہاتھ سے ہاتھ چھڑا لیتے کبھی ہم دونوں
پھر اسی جذب محبت کا سہارا لے کر
اس نے پھر ہاتھ دبایا مرا اصرار کے ساتھ

’مجھ سے تم دور نہ ہو، آؤ مرے ساتھ رہو‘
آج بھی دیکھتا ہوں میں اسے اس عالم میں
کہ مرے پاس کھڑی ہے لب خاموش کے ساتھ
پیکر حزن بنی، کانپتی تھراتی ہوئی--!!
***

مضامین
منٹو۔ نوری نہ ناری، ممتاز شیریں پتی ورتا ناری --- ڈاکٹر رؤف خیر

مکتبۂ شعر و ادب لاہور (۷۔ ڈی بلاک سی، سمن آباد لاہور) کے زیر اہتمام دو بالکل ایک جیسی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ دونوں پر تاریخ اشاعت درج نہیں ہے۔ ایک ٹھنڈا گوشت اور دوسری دھواں۔ دونوں کراؤن سائز پر ہیں اور دونوں کے سرورق پر منٹو کے صرف چہرے کا پنسل سکیچ ہے۔ ٹھنڈا گوشت دو سو بارہ صفحات پر مشتمل ہے جس کا انتساب ایشر سنگھ کے نام ہے جو حیوان بن کر بھی انسانیت نہ کھو سکا۔ اس میں آٹھ کہانیاں ہیں ٹھنڈا گوشت، گولی، رحمت خداوندی کے پھول، ساڑھے تین آنے، پیرن، خورشٹ، باسط اور شاردا۔ اس میں ’’زحمت مہر درخشاں‘‘ کے عنوان سے اٹھتر (78) صفحات کا پیش لفظ ہے جس میں منٹو پر دائر کردہ مقدمے کی پوری تفصیل درج ہے۔ ٹھنڈا گوشت پر کس نے مقدمہ دائر کیا کس کس نے اسے فحش قرار دیا اور کس کس نے اسے فحش نہیں بلکہ ادبی فن پارہ ٹھیرایا۔ دوسری کتاب دھواں (159) صفحات پر مشتمل ہے جس میں ’’دھواں‘‘ سمیت تیرہ کہانیاں ہیں۔ اس کا انتساب حسن عباس کے نام ہے۔ فی الحال اس دوسری کتاب سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہمارا موضوعِ بحث پہلی کتاب ہے۔ ٹھنڈا گوشت سعادت حسن منٹو کی بہت معروف کہانی ہے۔ اس کی عدم اشاعت و اشاعت کی تفصیلی روداد خود منٹو نے اپنے پیش لفظ ’’زحمت مہرِ درخشاں‘‘ میں بیان کی ہے جسے صیغۂ واحد غائب میں یہاں درج کیا جا رہا ہے:

’’منٹو بمبئی چھوڑ کر کراچی سے ہوتا ہوا غالباً سات یا آٹھ جنوری 1948ء کو یہاں لاہور پہنچا۔ منٹو اپنے عزیز دوست احمد ندیم قاسمی سے ملا۔ ساحرؔ لدھیانوی سے ملا۔ سب منٹو کی طرح ذہنی مفلوج محسوس ہو رہے تھے۔ منٹو کی طبیعت افسانہ نگاری کی طرف مائل ہی نہیں ہو رہی تھی۔ بالآخر کئی مہینوں کے بعد منٹو نے پاکستان میں اپنا پہلا افسانہ ٹھنڈا گوشت لکھا۔ فروغ اردو کے اشتراک سے احمد ندیم قاسمی نے ایک ماہ نامہ ’’نقوش‘‘ جاری کیا تھا۔ منٹو نے وہ افسانہ قاسمی کو دیا قاسمی نے وہ افسانہ (ٹھنڈا گوشت) منٹو کے سامنے ہی پڑھا اور معذرت بھرے لہجے میں کہا ’’منٹو صاحب معاف کیجئے افسانہ بہت اچھا ہے لیکن نقوش کے لیے بہت گرم ہے‘‘ اس لیے منٹو نے وہ افسانہ اُن سے واپس لے لیا اور قاسمی صاحب سے کہا کہ دوسرے دن آئیں تاکہ دوسرا افسانہ انھیں دیا جا سکے۔ دوسرے دن منٹو نے افسانہ ’’کھول دو‘‘ لکھ دیا۔ قاسمی صاحب وہ افسانہ لے کر گئے اور ’’نقوش‘‘ میں چھاپ دیا۔ حکومت کو یہ افسانہ امن عامّہ کے مفاد کے خلاف لگا چنانچہ نقوش کی اشاعت پر چھے مہینے کی پابندی عائد کر دی گئی۔

کافی دن بعد ’’ ادبِ لطیف‘‘ کے مدیر آ کر منٹو سے ’’ٹھنڈا گوشت‘‘ لے گئے۔ کتابت بھی کروا لی گئی تاہم یہ افسانہ شائع نہ ہو سکا اور ٹھنڈا گوشت پھر سعادت حسن منٹو کے پاس واپس آ گیا۔

اس دوران کراچی سے محترمہ ممتاز شیریں کے متعدد خطوط آ چکے تھے کہ منٹو ان کے ’’نیا دور‘‘ کے لیے کوئی افسانہ بھیجے۔ منٹو نے اٹھا کر ’’ٹھنڈا گوشت‘‘ ان کو بھیج دیا۔ کافی دیر کے بعد جواب آیا کہ ’’ہم دیر تک سوچتے رہے کہ اسے شائع کیا جائے یا نہیں افسانہ بہت اچھا ہے۔ مجھے (ممتاز شیریں کو) بہت پسند ہے لیکن ڈر ہے کہ حکومت کے احتساب کے

شکار نہ ہو جائیں“۔ ٹھنڈا گوشت یہاں سے بھی ٹھنڈا ہو کر واپس منٹو کے پاس پہنچ گیا۔ عارف عبد المتین ایک رسالہ ”جاوید“ کے ایڈیٹر کے اصرار پر ٹھنڈا گوشت انہیں دیا گیا جو مارچ 1949 کے ”جاوید“ میں شائع ہو گیا۔ چند دونوں بعد جاوید کے دفتر پر پولیس کا چھاپہ پڑا عارف کے ساتھ منٹو گرفتار کیے گئے۔ منٹو کی حمایت میں بیان دینے والے سید عابد علی عابد ایم اے ایل ایل بی پرنسپل دیال سنگھ کالج لاہور، پروفیسر نفسیات احمد سعید، فیض احمد فیض، خلیفہ عبدالحکیم ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کشمیر، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم گورنمنٹ کالج لاہور، منٹو کے خلاف ٹھنڈا گوشت کو فحش قرار دینے والے گواہ تھے مولانا (احسان اللہ خان) تاجور نجیب آبادی، شورش کاشمیری، ابو سعید بزمی اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر۔

تحت کی عدالت میں نصیر انور، عارف عبد المتین اور منٹو پر تین تین سو روپے جرمانہ اور صرف منٹو کو تین ماہ کی قید بھی سنائی گئی۔ فیصلے کے خلاف اپیل دائر کی گئی۔ یہاں بھی سزا بر قرار رہی البتہ نصیر انور (رسالہ جاوید کے مالک) عارف عبد المتین کی سزا میں تخفیف کر دی گئی۔ یعنی اکیس اکیس یوم کی سزا گر تین تین سو روپے جرمانہ ادا نہ کریں۔ دوبارہ اپیل پر سیشن کی عدالت میں جج نے تینوں ملزموں کو بری کر دیا۔“ یہ تو تھے جملہ ہائے معترضہ۔ بطورِ تمہید۔

اپنے رسالہ ”نیا دور“ میں منٹو کا افسانہ ”ٹھنڈا گوشت“ شائع کرنے سے معذوری کا اظہار کرنے والی ممتاز شیریں منٹو کی قد آوری کی قائل تھیں۔ مکتبۂ شعر و ادب لاہور کے زیر اہتمام شائع ہونے والی مذکورہ دونوں کتابوں کے سرورق آخر پر ممتاز شیریں کی یہ رائے درج ہے۔

”منٹو آدم کی جرأت گناہ کا قائل ہے۔ منٹو کا انسان نوری ہے نہ ناری ہے وہ آدمِ خاکی ہے۔ وہ وجودِ خاکی جس میں بنیادی گناہ فساد، قتل و خون وغیرہ کے باوجود خدا نے نوری فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں۔“

”منٹو۔ نوری نہ ناری“ (جملہ حقوق بحق صمد شاہین محفوظ) اشاعت اول 1985مکتبۂ اسلوب پوسٹ بکس ۲۱۱۹۔ کراچی ۱۸ جو منٹو اور ممتاز شیریں کی وفات کے برسوں بعد شائع ہوئی وہ بھی ادھوری کیوں کہ اس کے آخری دو اہم باب بہ وجوہ لکھے ہی نہیں جا سکے۔ یہ نایاب کتاب ریختہ ڈاٹ کام Rekhta.com پر دستیاب ہے۔ مرتبِ کتاب آصف فرخی نے حرفے چند میں بتایا۔

”صمد شاہین صاحب کی اطلاع یہ ہے کہ منٹو اور ممتاز شیریں کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی“۔

منٹو نے صمد صاحب کے توسط سے اپنی ایک کتاب (؟) ان کو یہ جملہ لکھ کر بھیجی:

”ممتاز شیریں کے نام جو مجھ پر کتاب لکھ رہی ہیں“

کیوں کہ اس وقت تک زیر قلم کتاب کے دو باب ”سویرا“ میں شائع ہو کر اہل نظر سے داد پا چکے تھے۔ ایک انٹرویو میں اپنی بہترین تحریروں کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ممتاز شیریں کہتی ہیں:

”علمی اور تخلیقی تنقید کے سب سے اچھے نمونے منٹو پر میرے متفرق مضامین ہیں۔ ان میں میں نے اپنے مخصوص تاثراتی اندازِ نقد سے ہٹ کر نفسیاتی زاویۂ نظر سے جائزے لیے ہیں۔ منٹو پر لکھتے ہوئے میں نے جنسی نفسیات پر بہت کچھ پڑھا، فرائیڈ، ہیولاک ایلس سے لے کر کِنسے رپورٹ، سیموں د بوار کی دوسری جنس اور کولن ولسن تک۔ کیوں کہ منٹو کے افسانے جنسی نفسیات کے مطالعے کے لیے بہت اچھا مواد فراہم کرتے ہیں۔ یہ مضامین در اصل منٹو پر میری زیر تحریر کتاب ”نوری نہ ناری“ کے چند باب ہیں۔“

ممتاز شیریں 12 ستمبر 1924 کو ہندو پور موجودہ آندھرا پردیش انڈیا میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد کا نام قاضی عبد الغفور خان اور والدہ کا نام نور جہاں تھا۔ ان کی ابتدائی زندگی میسور کرناٹک میں گزری جہاں ان کے نانا نانی نے ان کی پرورش کی۔ مہارانی کالج میسور سے بی اے کرنے کے بعد اگست 1942 میں ان کی شادی صمد شاہین سے ہو گئی (کراچی یونیورسٹی سے ممتاز شیریں نے ایم اے کیا)۔

ممتاز شیریں کا پہلا افسانہ ”انگڑائی“ رسالہ ”ساقی“ دہلی میں 1943 کے ایک شمارے میں چھپتے ہی ان کی دھوم مچ گئی۔ ممتاز شیریں اور صمد شاہین نے مل کر 1944 میں بنگلور سے ”نیا دور“ رسالہ جاری کیا جو 1944 سے 1947 تک بنگلور سے پھر 1947 سے 1953 تک کراچی سے نکلتا رہا۔ یہ میاں بیوی قیام پاکستان کے ساتھ ہی کراچی آ گئے تھے آ کر نیا دور کا فسادات نمبر بھی نکالا تھا۔

ممتاز شیریں نے جان سٹائن بیک کے ناول The Pearl کا ترجمہ در شہوار کے نام سے 1957 میں کیا۔ کاموؔ کے ناول ”اجنبی“ کا ترجمہ بھی ممتاز شیریں نے کیا تھا جو شائع نہ ہو سکا۔ (بحوالہ منٹو نوری نہ ناری۔ مکتبۂ اسلوب کراچی)

ممتاز شیریں نہ صرف یہ کہ خود بہت اچھی قلم کار و صحافی تھیں، مطالعے کا نکھرا ستھرا ذوق بھی رکھتی تھیں بلکہ ان کی جستجو تھی کہ ادیبوں شاعروں کے ساتھ ساتھ با ذوق قارئین تک ہر زبان کی معیاری کتابیں بھی پہنچیں۔ چنانچہ انھوں نے اعلی پیمانے پر کتابوں کی ایک فرم بھی کراچی میں قائم کر رکھی تھی اور چاہتی تھیں کہ ایسا ہی ایک ادارہ لاہور میں بھی وہ قائم کریں۔ اس سلسلے میں وہ محمد طفیل کے نام ایک خط ۲۵ء جنوری ۱۹۵۶ء کے پس نوشت (ps)کے طور پر لکھتی ہیں:

’’شاید ہم آپ کے ہمسائے ہو جائیں۔ ہماری کتابوں کی دوکان Thomas & Thomasکی لاہور میں ایک برانچ کھولنے کا ارادہ ہے اور غالباً ’’مال‘‘ ہی پر ایک دوکان دیکھی ہے۔ ہم خود تو لاہور نہیں آئیں گے بلکہ ہماری فرم کے نمائندے! بہر حال‘‘

(مدیر ’’نقوش‘‘ محمد طفیل کے نام چالیس خطوط لکھنے والی ممتاز شیریں کی ملاقات کبھی اُن سے نہیں ہو پائی۔)

حیدرآباد دکن میں بھی 1965-66 کے آس پاس روزنامہ ’’سیاست‘‘ کے زیر اہتمام قائم کردہ ادبی ٹرسٹ کے تحت جہاں کئی ہند و پاک اور کل ہند مشاعرے منعقد ہوئے وہیں ادبی ٹرسٹ ہی کی زیر نگرانی مشہور و معروف شاہ راہ عابڈس پر ایک بنک کی راہ داری میں ہند و پاک کے معیاری رسائل کا ایک بُک سٹال قائم کیا گیا تھا جس کے نگران ایک شاعر حفیظ فضا تھے۔ اس دور میں اورینٹ ہوٹل بھی وہیں تھا۔

ممتاز شیریں بہت قابل پڑھی لکھی قلم کار تھیں۔ تقدیم و تاخیر کے بغیر صرف ان کی قابلیت کے ثبوت میں میں یہاں ان کے ایک خط کا اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں جو انھوں نے مدیر نقوش محمد طفیل کو لکھا تھا۔

۸۔ ایف۔ گپتا میانشن، نزد پلازا سینما بندر روڈ کراچی ۳
۲۳ ، اپریل 1957

مکرمی سلام مسنون

میں کوشش کروں گی کہ مضامین جتنا جلد ہو سکے آپ کو بھجوا سکوں۔۔ ۔

میرے عدم تعاون کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صرف فرصت کی کمی ہے۔ بات یہ ہے کہ بعض کام یوں ظاہر میں تو نظر نہیں آتے لیکن ان میں وقت کافی لگ جاتا ہے۔ چنانچہ ابھی میں نے اپنے چند افسانوں کے انگریزی میں ترجمے کیے ہیں۔ یہ کام میں آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے کر لیتی ہوں L'Alliance Francaise کے سکریٹری جنرل کا اچانک تبادلہ ہو گیا اور وہ پیرس چلے گئے۔ انھوں نے میرے دو ایک افسانوں کے ترجمے فرانسیسی میں کیے تھے۔۔ ۔۔ وہ میرا مجموعہ ہی فرانس میں چھپوانا چاہتے ہیں۔ لہٰذا مجھے چند افسانوں کے انگریزی ترجمے اسی دوران میں کرنے پڑے۔ یوں مجھے فرانسیسی آتی تو ہے لیکن میں اتنی زبان دانی کا دعویٰ تو نہیں کر سکتی کہ اپنے افسانوں کا خود ہی اچھا فرانسیسی ترجمہ کر سکوں۔ لہٰذا جب ایک فرانسیسی سکالر ہی نے یہ پیش کش کی تو میں نے سوچا یہ وقت اچھا ہے۔

اس طرح ایملی برونٹے پر میں نے جو کام کیا ہے اس کی بنا پر مکتبۂ جدید نے بھی ایملی کے نادر ناول ’’وُدرنگ ہائٹس‘‘ کا ترجمہ میرے ذمے کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایملی اور ’’وُدرنگ ہائٹس‘‘ تو میرے لیے Passion بن گئے ہیں۔ اس طرح کے مستقل کام میں نے سنبھال لیے ہیں کہ رسالوں (میں اب) کم ہی نظر آتی ہوں۔ بہت سے رسالوں کے ایڈیٹر یہ اصرار کرتے ہیں کہ کچھ ’’تبرک‘‘ کے طور پر ہی دے دوں۔ منٹو پر کتاب کے دو چار صفحے ہی سہی۔ تو تقاضوں سے مجبور ہو کر انھیں چند ایک صفحے دے دیتی ہوں یا کوئی ہلکا سا مضمون۔ لیکن آپ کا ’’نقوش‘‘ ظاہر ہے کہ ان پرچوں میں سے نہیں ہے جسے ’’تبرکاً‘‘ کچھ دیا جائے۔ آپ کے لیے تو کوئی معقول چیز ہی بھیجنی چاہیے۔۔ (صمد) شاہین اچھے ہیں آپ کو سلام کہتے ہیں۔ اُمید آپ مع الخیر ہوں گے۔ نیاز کیش

ممتاز شیریں

محمد طفیل صاحب کے نام اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ’’منٹو۔ نوری نہ ناری‘‘ کی تکمیل میں ممتاز شیریں کی کیا کیا مصروفیات حائل رہیں۔

محمد طفیل کے نام ایک خط مورخہ ۲۴، مئی ۱۹۵۷ء کو ایک مضمون کی خبر دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

’’مضمون تیار ہے۔ اس کا عنوان میں نے ’’میں مادام بواری ہوں‘‘ رکھا ہے جو فلائبیر کا ایک معنی خیز مقولہ ہے اور فن کار اور تخلیق کے گہرے رشتے کا مظہر ہے‘‘۔

’’منٹو۔ ممتاز شیریں کی نظر میں‘‘ جناب مظفر علی سید کے ایک مقالے کے مطابق ممتاز شیریں نے منٹو کی طرف اپنی مفصل توجہ کا یہ جواز فراہم کیا ہے:

’’منٹو اک سچا اور بے باک فن کار تھا۔ اک آگ تھی جس میں وہ مسلسل تپتا رہتا تھا۔ منٹو کے افسانوں میں بلا کی جان ہے اور ان کا تاثر ہر سطح کے پڑھنے والے قبول کرتے ہیں۔ یوں تو میں نے بہت سے افسانہ نگاروں کا اپنے مضامین میں جائزہ لیا ہے (ایک مدت تک منٹو کا جائزہ تو کیا اس کا نام بھی نوکِ قلم تک آنے نہیں دیا) لیکن منٹو پر ایک کتاب لکھنے کا خیال اس لیے آیا تھا کہ میری نظر میں منٹو ہمارا نمائندہ اور بہترین افسانہ نگار ہے‘‘۔ (بحوالہ ’’منٹو نوری نہ ناری‘‘ مکتبہ اسلوب کراچی۔ ۱۸)

مظفر علی سید کے خیال کے مطابق منٹو کے بارے میں ممتاز شیریں کا یہ انداز سر پرستانہ لگتا ہے اور مظفر علی

سید نے ''میگھ ملہار'' کے دیباچے میں اپنے ابتدائی افسانوں کے حوالے سے جو کچھ ممتاز شیریں نے لکھا وہ بھی Quote کیا ہے: (یہاں بھی اس کا اقتباس درج کیا جاتا ہے)

''۔ ۔ کہ انسانی سرشت میں شر کے وجود سے آگاہ ہونے کے باوجود میں اس شر کو چھوتے ہوئے ڈرتی تھی۔ ۔ بڑے بڑے ادیبوں اور نقادوں کی رائے میں شر کے تصور کے بغیر کوئی گہرا ادب تخلیق نہیں ہو سکتا۔ شر کے وجود کو تسلیم کر لینے کے بعد مجھ میں آہستہ آہستہ نا مکمل انسان کا تصور گھر کرتا گیا جو معصوم فطری انسان کے تصور سے بلند تر تصور ہے جس میں انسان خیر و شر کا مجموعہ ہے۔ اس کی فطرت کے ان دونوں پہلوؤں میں مسلسل اندرونی کشمکش جاری رہتی ہے۔ بے راہ روی اور گناہ کا احساس اسے ایک مسلسل روحانی کرب و اضطراب میں مبتلا رکھتا ہے۔ یہ انسان اپنی فطری حیوانی جبلتوں پر فتح پا کر بلند ہو سکتا ہے اور نامکمل ہونے کے باوجود اپنی تکمیل میں کوشاں رہتا ہے۔ بڑے ادب میں انسان کا یہی تصور ہے۔ آگے چل کر یہی تصور منٹو پر میری کتاب ''نوری نہ ناری'' کا مرکزی موضوع بنا۔ ۔ پیچھے مڑ کر جب اس دور پر نظر جاتی ہے جس وقت منٹو سے غفلت، تغافل یا خوف محسوس ہوا کرتا تھا تو وہ زمانہ بچپنے کا زمانہ لگتا ہے۔ ۔ میری نظر میں اُن تنقیدی مضامین کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے جو میں نے تقسیم سے پہلے لکھے تھے۔ ۔ یہ مضامین اتنی چھوٹی عمر میں لکھے گئے تھے کہ ان میں سنجیدگی، سلجھاؤ اور توازن کا فقدان تھا۔ اب تنقید میں میں نے جو بہتر کام کیا ہے، وہ تقسیم کے بعد ہی کیا ہے۔ چناں چہ منٹو کا مطالعہ ہے جسے میں اپنی تنقیدی کاوشوں میں سب سے بہتر اور اہم سمجھتی ہوں۔''

(بحوالہ ''ادبِ لطیف'' جوبلی نمبر 63 نقادوں سے دس سوال) منٹو نوری نہ ناری صفحہ 24-25

اس مرحلے پر یہ ذکر بھی دل چسپی سے خالی نہ ہو گا کہ ترقی پسندی کے ایک حیدرآبادی اجلاس کی قرار داد کی روداد بیان کرتے ہوئے اختر حسن نے اپنی خود نوشت سوانح کچھ یادیں کچھ باتیں (مرتبہ ڈاکٹر شجاعت علی راشد مطبوعہ 2019 ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی۔ 6) میں بتایا کہ اس قرار داد میں عریانی و فحاشی سے بچنے پر زور دیا گیا تھا۔ اگلی ہی صف میں حسرت موہانی بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے احتجاج کیا اور کہا ''دنیا کا جتنا آرٹ ہے، ادب ہے سب میں آپ کو عریانی ملے گی۔ شاعری میں بھی ہوتی ہے۔ عریانی میں کوئی مضائقہ نہیں مگر وہ شائستہ اور لطیف ہونی چاہئے۔'' اس پر سبطِ حسن نے کہا کہ ''مولانا (حسرت موہانی) صحیح بات کہتے ہیں مگر غلط موقع پر کہتے ہیں'' (اس اجلاس کی روداد کرشن چندر نے ''پودے'' کے عنوان سے لکھی تھی)

شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور پاکستان کے زیر اہتمام 2005-2006 میں ''تحقیق نامہ'' شائع ہوا ہے۔ ادارۂ ''نقوش'' کے روح رواں محمد طفیل کا پانچ جولائی 1986 کو انتقال ہوا۔ ان کے فرزند جاوید طفیل نے ہند و پاک مشاہیر کے جناب محمد طفیل کے نام لکھے ہوئے پانچ ہزار مکاتیب کا نایاب ذخیرہ جی سی یونیورسٹی (لاہور) کو بطور عطیہ دیا۔ راقم الحروف (رؤف خیر) کے پاس 2005-2006 کا یہ ان مول ''تحقیق نامہ'' ہے جو محمد طفیل کی بیسویں برسی کی مناسبت سے بیس مرحوم مکتوب نگاران کے محمد طفیل کے نام چارسو مکاتیب پر مشتمل ہے۔ ان میں ممتاز شیریں کے چالیس نایاب خطوط بھی ہیں۔ مخفی مباد ممتاز شیریں نے بہ مشکل اڑتالیس سال کی عمر پائی۔ وہ اور ان کے شوہر ڈاکٹر صمد شاہین بڑی خوش گوار زندگی گزارتے رہے ان کے دو بچے ہیں جن کی تعلیم و تربیت پر دونوں توجہ دیتے رہے۔ پتہ نہیں وہ بچے ماں باپ کا نام کس حد تک روشن کر رہے ہیں: محمد طفیل کے نام ممتاز شیریں نے جو پہلا خط بنگلور سٹی سے لکھا تھا وہ یکم نومبر 1946 کا ہے۔ خط ۷۸۶ سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد پھر کسی خط پر یہ ہندسہ ۷۸۶ نظر نہیں آتا۔

بنگلور سٹی۔ ۱۔ نومبر ۱۹۴۶ء

مکرمی تسلیم۔ پرسوں جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کا خط آیا تھا کہ آپ ان کی کتابیں ''آبلے'' اور ''رم جھم'' ریویو کے لیے بھجوا رہے ہیں لیکن ابھی تک ہمیں یہ کتابیں نہیں ملی ہیں۔ از راہِ مہربانی دونوں کتابیں بھجوا دیں تاکہ ہم تفصیلی تبصرہ کروا سکیں اور مجھے اس وجہ سے بھی جلدی ہے کہ میں ''آبلے'' کے افسانوں کا ذکر اپنے مضمون ۴۵ء اور ۴۶ء کے افسانوں میں کرنا چاہتی ہوں۔ یہاں تو کہیں یہ کتاب دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن سنا ہے کہ یہ افسانے بہت اچھے ہیں۔

دونوں کتابیں جلد بھجوا سکیں تو بہت عنایت ہو گی۔ نیاز آگیں۔ ممتاز شیریں

پتہ: جناب محمد طفیل صاحب مالک ادارۂ فروغ اردو۔ اندرونی لوہاری دروازہ۔ لاہور

ممتاز شیریں نے پہلا خط جو بنگلور سٹی انڈیا سے 1946 میں لکھا تھا وہ محمد طفیل مدیر نقوش کے نام (بیس مرحومین کے چار سو مکاتیب کے) اس ذخیرے میں سب سے قدیم مکتوب قرار دیا گیا ہے۔ ممتاز شیریں کے ان چالیس خطوط سے ان کی بیماریوں اور سفروں کا حال بھی معلوم ہوتا ہے جو وہ اپنے شوہر ڈاکٹر صمد شاہین کے ساتھ دنیا کے مختلف ملکوں کا دورہ کرتی رہیں۔ وہ ہر مقام سے جناب محمد طفیل کو لکھتی ہیں کہ ان کے نام ''نقوش'' بھیجا جاتا رہے۔ محمد طفیل ان سے تخلیقات اور ان کی تصویر کا مطالبہ بھی کرتے ہیں۔ پاکستان پہنچنے کے بعد ممتاز شیریں نے جو خط لکھا وہ یوں ہے:

8F۳ گپتا منشن نزد پلازا کراچی

۲۷فروری ۱۹۵۰ء

مکرمی سلام مسنون

آپ کا خط مل گیا تھا۔ شکریہ۔ آپ نے ''نقوش'' کے خاص نمبر کے لیے ایک افسانہ اور بڑے سائز کی تصویر بھیجنے کے لیے لکھا ہے۔ افسانہ تو میرے پاس کوئی نہیں ہے البتہ رپورتاژ پر ایک تازہ مضمون لکھا ہے۔ یہ میں آپ کو بھیج دیتی ہوں لیکن اسے ذرا صاف کر کے نقل کرنا ہے اور ان دنوں میں بیمار ہوں۔ یہ خط بھی بچھونے پر سے لکھ رہی ہوں۔ جب صحت کچھ اچھی ہو جائے تو یہ مضمون نقل کر کے آپ کو بھیج سکوں گی۔ امید آپ مع الخیر ہوں گے۔ نیاز کیش ممتاز شیریں

اُن کے چالیس بہت معلوماتی خطوط میں سے چند ہی خطوط کے اقتباسات میں اپنے مضمون کی مناسبت سے یہاں پیش کر رہا ہوں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سعادت حسن منٹو کے فکر و فن سے کس قدر متاثر تھیں۔ ایک خط کا اقتباس دیکھیے:

گپتا منشن نزد پلازا کراچی ۳ 8F

۱۶جنوری ۱۹۵۲ء

مکرمی سلام مسنون

۔۔ ۔ منٹو صاحب پر میں ایک کتاب لکھ رہی ہوں۔ شاید اس کا کوئی حصہ مکمل کر کے بھیج سکوں۔ اس دفعہ کا نقوش Imposing ہے۔ البتہ مضامین کے حصے میں یہ احساس ہوتا ہے کہ کئی ایک چیزیں محض تبرکاً ہی شامل ہوئی ہیں۔ عبادت بریلوی صاحب کے مضمون میں جو Factual غلطیاں ہیں سو ہیں۔ موضوع کو انھوں نے سمجھا ہی نہیں ہے۔ ادب پر آج کل جو جمود چھایا ہوا ہے وہ تعداد کے لحاظ سے نہیں بلکہ معیار کے لحاظ سے ہے۔ معمولی چیزیں کتنی بھی لکھی جائیں، صرف چند اچھی چیزوں کی بات نہیں آ سکتی۔ مشکل یہ ہے کہ آج کل کوئی لکھ ہی نہیں رہا ہے اور پرچوں کو زندہ رکھنا بہت دشوار معلوم ہو رہا ہے۔ ''نیا دور'' کے لیے بھی ہمیں یہی دشواریاں پیش آ رہی ہیں میرا خیال ہے کہ آپ ''نقوش'' کو Quarterly بنا دیں تو اتنی دقت کا سامنا کرنا نہ پڑے گا۔ امید آپ مع الخیر ہوں گے۔

نیاز کیش ممتاز شیریں۔

۱۶,جنوری ۱۹۵۲ء کو ممتاز شیریں نے منٹو پر کتاب لکھنے اور اس کا کچھ حصہ ''نقوش'' میں چھپنے کے لیے دینے کی بات کی تھی۔ آگے ۲۲,فروری کو اس میں جو پیش رفت ہوئی ہے اس کا ذکر ہے۔ اقتباس دیکھیے:

نیا دور 8F گپتا میانشن۔ نزد پلازا کراچی ۳

۲۲,فروری ۱۹۵۲ء مکرمی سلام مسنون

۔۔ ۔ ان دنوں میری طبیعت کچھ ناساز ہو گئی تھی۔ پانچ چھے دن تک ہلکا بخار بھی رہا۔ اس لیے مضمون آپ کو وقت پر بھیج نہ سکی۔ مضمون تیار ہے۔ لیکن چوں کہ یہ کتاب کا ایک حصہ ہے، میں اسے ایک سے دو تین دفعہ غور سے دیکھ رہی ہوں۔ بہر حال مضمون میں آپ کو ضرور بھیجوں گی۔ ایک ہفتہ یا کم از کم پانچ چھ دن کی اور مہلت دے دیجئے۔ یہ مضمون جیسا کہ میں نے آپ کو مطلع کیا تھا، منٹو پر کتاب ''نوری نہ ناری'' کا ایک حصہ ہے اور میری تحریر کے فل سکیپ سائز کے کوئی پندرہ سولہ صفحات کا ہے''۔۔ ۔

ممتاز شیریں بے چاری واقعی بیمار چل رہی تھیں اس لیے وہ وعدے کا پاس نہیں رکھ پا رہی تھیں اپنے اگلے خط میں دیکھیئے وہ کیا فرماتی ہیں:

۸۔ ایف گپتا میانشن، نزد پلازا، کراچی ۳

۹,مارچ ۱۹۵۲ء مکرمی سلام مسنون

''نقوش'' کا خاص نمبر اب کس منزل میں ہے؟ اور آپ کو مضمون بھیجنے کی آخری تاریخ کیا ہے؟ (صمد) شاہین نے مجھے بتایا تھا کہ لاہور میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی اور آپ نے مضمون جلد بھجوانے کو کہا تھا۔ مضمون تیار ہے اور میں اسے نقل کر رہی ہوں۔ میں نے شاید آپ کو پچھلے خط میں لکھا تھا کہ مضمون میری تحریر کے فل سکیپ پندرہ سولہ صفحات میں آئے گا۔ اب میں نے اس میں کافی اضافہ کر دیا ہے اور اس کے کم از کم پچیس ۲۵ صفحات ہوں گے۔ کیا نقوش میں اس کے لیے گنجائش نکل سکے گی؟ (صمد) شاہین میرا مضمون دیکھنا چاہتے تھے لیکن وہ بالکل دیکھ ہی نہ پائے کیوں کہ لاہور سے لوٹنے کے فوراً بعد انھیں گورنر جنرل کے ساتھ پھر سرحد کے دورے پر جانا پڑا۔ اب وہ پانچ چھ دن میں لوٹیں گے اور میں مضمون اسی وقت آپ کو بھیج دوں گی۔ امید آپ مع الخیر ہوں گے۔ نیاز کیش ممتاز شیریں

تقریباً ڈھائی سال وہ منظر نامے سے غائب رہیں پھر اچانک ایک خط میں لکھتی ہیں:

گپتا میانشن نزد پلازا، کراچی 8F۳

۲۱,دسمبر ۱۹۵۴ء

مکرمی سلام مسنون آپ کا کارڈ ملا۔ یاد آوری کا شکریہ
جی ہاں میں جون ہی میں یورپ چلی گئی تھی اور اکتوبر میں واپس آئی۔ (صمد) شاہین ابھی تک ہالینڈ میں ہیں۔“ (اقتباس)

اس عرصے میں ادبی دنیا کے نابغۂ روزگار سعادت حسن منٹو صرف ۴۳ تینتالیس سال کی عمر میں بہ عارضۂ تپ دِق ۱۸جنوری ۱۹۵۵ء کو رحلت کر گئے اور لاہور میانی صاحب میں تدفین عمل میں آئی۔ ممتاز شیریں اس دوران منٹو کے فکر و فن سے بہت متاثر ہو چکی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے منٹو میموریل قائم کیا جس کی وہ خود اعزازی سکریٹری تھیں۔ منٹو میموریل کے لیٹر ہیڈ پر محمد طفیل کے نام خط لکھا گیا تھا اس کا اہم اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

منٹو میموریل۔ 8 Fگپتا میانشن نزد پلازا کراچی ۳
فروری ۱۹۵۵ء مکرمی سلام مسنون

آپ کے دونوں کارڈ ملے۔ منٹو پر مضمون انشاء اللہ (ان شاء اللہ) آپ کو مارچ کے پہلے ہفتے میں مل جائے گا۔ مضمون طویل نہیں ہو گا۔ اس میں صرف یہ بتانا ہے کہ وہ کون سا آخری تکمیلی نکتہ تھا جس تک منٹو پہنچے تھے“

سب سے پہلے ۱۶جنوری ۱۹۵۲ء کے اپنے خط میں ممتاز شیریں نے محمد طفیل کو اطلاع دی تھی کہ منٹو پر وہ اک کتاب لکھ رہی ہیں جس کا اک حصہ پندرہ سولہ صفحات پھر پچیس صفحات تک پھیلا تھا۔ بے چارہ منٹو جان ہی نہ سکا کہ اس پر اپنی کتاب میں وہ آخر کیا لکھ رہی ہیں۔

اب جو ممتاز شیریں نے منٹو میموریل کی داغ بیل ڈالی تو اس کے اغراض و مقاصد بھی فروری ۱۹۵۵ کے خط میں یوں بیان ہوئے ہیں:

”منٹو میموریل کے نام سے منٹو پر ایک یادگار اور سیر حاصل مجموعہ شائع کرنے کی تجویز پیش ہوئی ہے جس میں سب اچھے اچھے ادیبوں کی طرف سے منٹو کو Tributes ہوں گے اور فن اور شخصیت پر مضامین، اور اس کے ساتھ منٹو کے افسانوں کا انتخاب۔ یہ منٹو کی خدمت میں ہم سب ادیبوں کی طرف سے ایک ہدیہ ہو گا جس کی حیثیت مستقل ہو گی اور اس کتاب کی ساری آمدنی صفیہ منٹو صاحبہ کی خدمت میں ہم ادیبوں کی طرف سے پیش کی جائے گی۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ آج کل بڑی تکلیف دہ مالی دشواریوں سے گزر رہی ہیں۔ منٹو نے اپنے خون سے ادب کو سینچا، اپنی ساری زندگی ادب کے لیے وقف کر دی۔ ظاہر ہے کہ یہاں کوئی ادیب صرف ادب کے سہارے جی نہیں سکتا۔ لیکن منٹو نے بڑی ہمت سے یہ صلیب اپنے شانوں پر اٹھائی اور آخر دم تک ثابت قدم رہا۔ لیکن اب جب کہ اس کے متعلقین کو بے حددشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہ ہے، ہم سب کا فرض ہے کہ ساتھ مل کر مدد کریں۔ ساتھ ہی یہ تجویز بھی پیش کی گئی ہے کہ حکومت پنجاب اور مرکزی حکومت سے ان کے نام وظیفہ مقرر کرنے کی درخواست کی جائے۔ یہاں ہم لوگ مرکزی حکومت کو Approachکریں گے۔ لاہور سے آپ لوگ حکومت پنجاب کو اس طرف توجہ دلا سکیں تو بہت اچھا ہو گا۔ نیاز کیش ممتاز شیریں

18 جنوری 1955 کو منٹو کے گزر جانے کے بعد ان کے بے یار و مددگار افرادِ خاندان کی مالی امداد کے لیے ٹھوس اقدامات کرتے ہوئے ممتاز شیریں نے منٹو میموریل قائم کر کے عملی ثبوت دیا۔ حالانکہ وہ خود بیمار چل رہی تھیں۔ چناں چہ اپنے ایک خط میں وہ مدیر ”نقوش“ محمد طفیل کو لکھتی ہیں:

گپتا میانشن نزد پلازا کراچی 8F۳

۱۰مارچ ۱۹۵۵ء

مکرمی سلام مسنون

مضمون ”منٹو کی فنی تکمیل“ بھیج رہی ہوں۔ رسید سے مطلع کریں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اس سے جلد بھیج سکوں لیکن پچھلے چند دنوں سے بیمار ہوں۔ بات یہ ہے کہ آکسفورڈ میں میرا نزلہ کا علاج ادھورا رہ گیا تھا۔ اب وہاں سے انجکشن آ گئے ہیں اور میں ہر دوسرے روز ایک انجکشن لے رہی ہوں۔

میں آپ کی ممنون ہوں کہ منٹو میموریل کے سلسلے میں آپ نے ہر طرح سے تعاون کا یقین دلایا ہے اور آپ کے ہاں چھپے ہوئے مجموعوں سے کچھ لینے کی بھی اجازت دی ہے۔ آپ نے لکھا تھا کہ ”منٹو میموریل“ پر چھپا ہوا جو مواد میں نے بھجوایا تھا وہ صفیہ صاحبہ لے گئی ہیں اور میں مزید آپ کو بھجوا دوں۔ یہ مواد بھی ساتھ ہی بھیج رہی ہوں۔ منٹو پر کتاب کے سلسلے میں (صمد) شاہین سے میں مشورہ کرنا چاہتی ہوں۔ اس کتاب کے دو اک باب اور لکھنے باقی ہیں۔ مکمل مسودہ میرے خیال میں فل سکیپ سائز کے کوئی سوا دو سو ڈھائی سو صفحوں کا ہو جائے گا۔ ساتھ ہی اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو رہا ہے کیوں کہ یہ کتاب انگریزی میں بھی چھپے گی۔

امید آپ مع الخیر ہوں گے۔ نیاز کیش ممتاز شیریں

وہ ممتاز شیریں جس نے منٹو پر پندرہ سولہ صفحات کا مضمون لکھنا شروع کیا تھا جو بڑھتے بڑھتے پچیس صفحات تک پھیل گیا تھا پھر منٹو کی فنی تکمیل کے نکتے سُجھانے لگیں تو یہ سلسلہ ڈھائی سو صفحات فل سکیپ تک جا پہنچا۔ ان کے

خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ بہ امید منظوری منٹو پر انہوں نے جو کچھ لکھا وہ ڈرافٹ فار اپروول Draft for Approval ہوا کرتا تھا اور یہ اس وقت تک اشاعت کے لیے دیا نہ جا سکتا تھا جب تک کہ وہ ان کے شوہر صمد شاہین کی نظر سے گزرتا نہ ہو۔ اس میں شک نہیں ممتاز شیریں کے شوہر ڈاکٹر صمد شاہین ایک ذمہ دار سرکاری اعلیٰ افسر کے ساتھ ساتھ صاحب نظر بھی تھے۔

منٹو پر آخری مضمون ممتاز شیریں نے تقریباً مرض الموت سے گزرتے ہوئے اس احساسِ ذمہ داری کے تحت لکھا کہ وہ منٹو کی پندرھویں برسی کے موقع پر مضمون پڑھنے کا وعدہ کر چکی تھیں۔ ۔ ''منٹو کی موت کے بعد سے اب تک اس کتاب کا مکمل نہ کرنا میرے لیے ایک احساس جرم بن گیا ہے''۔ (بحوالہ منٹو نوری نہ ناری)

آنتوں کے کینسر کا شکار ہو کر بالآخر ممتاز شیریں بھی 11مارچ 1973ء کو دنیا سے کوچ کر گئیں تاہم ادبی دنیا میں اپنے کارنامے چھوڑ گئیں۔ انھوں نے منٹو پر اپنی کتاب مکمل کرنے کی گویا سو گند کھائی تھی مگر وہ قسم پوری نہ کر سکیں اور نہ اس کا ''کفارہ'' ہی ادا کر سکیں۔

مآخذ:

۱۔ تحقیق نامہ 2005- 2006شعبہ اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، پاکستان

۲۔ منٹو۔ نوری نہ ناری۔ ممتاز شیریں (ریختہ ڈاٹ کام Rekhta.com کے حوالے سے) مکتبہ اسلوب کراچی ۱۸۔ مرتبہ آصف فرخی

۳۔ ٹھنڈا گوشت۔ مکتبۂ شعر و ادب لاہور۔ سعادت حسن منٹو۔ تاریخ اشاعت ندارد (زحمتِ مہر درخشاں)

۴۔ ادب لطیف لاہورجوبلی نمبر 63نقادوں سے دس سوال (بحوالہ منٹو نوری نہ ناری صفحہ 24-25)

***

امتیاز علی خان عرشی: اردو کے متنی تحقیق اور انتقادات کے بنیاد گذار اور جدید تفہیمی ماہر غالبیات ۔۔۔ احمد سہیل

شان نزول

ستر کی دہائی میں جب میں نے جدید ادبی نظریات اور بالخصوص ساختیات اور اس کے اطلاقی اور عملیاتی پہلوں پر کام کرنا شروع کیا تو یہ کرید بھی ہوئی کہ اردو میں ساخیتاتی لسانی اور ادبی نظرئیے میں کن مثالوں کے ساتھ اس نظرئیے اور مناجیات کا اطلاق کیا جائے؟ پہلے تو کئی سال گہرا مطالعہ کیا مگر اس سلسلے میں اپنے سے پہلے اردو میں ناقدین اور محققین سے کچھ اشارے تک نہیں ملے اور میرے ہم عصر اردو کے ادبی دانش ور بھی اس پر مجھ سے نہ کوئی بات کر سکے اور نہ ان سے کوئی رہنمائی ملی اور مجھے اس وقت اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ اردو تنقید اور تحقیق کا فکری اور مناجیاتی ڈھانچہ بالکل کھوکھلا ہے۔ اس پر کوئی بات کرنے کو تیار نہیں۔ لہذا میں نے اپنے طور پر کام کرنا شروع کر دیا۔ ساختیات کا سب سے قریبی تعلق متنی مطالعوں اور تجزیات سے ہوتا ہے۔ تو اسی تعلق سے میں نے اردو کے تنقیدی اور تحقیقی تحریروں کو گہرائی سے مطالعہ کیا۔ اس زمانے میں امریکہ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ میں نے اپنی جامعہ کے شعبۂ انگریزی کے اساتذہ اور اس کے عالموں سے ساختیاتی نظرئے کے حوالے ''متنی تجزیات'' کی مناجیات اور طریق کار پر بات کی اور یہ تکنیک بھی سیکھی کہ کیسے متن کی قرات کی جائے اور اس کا تجزیہ کیسے کیا جائے؟

اس کے بعد میں نے اردو کے کئی نقادوں اور محققین کو پڑھا اور اس موضوع پر کے لیے مجھے امتیاز علی خان عرشی بہتر محسوس ہوئے۔ اور اس درویش منش محقق تحقیقی اور تنقیدی تحریروں کو بڑی مشکل سے جمع کیا، اور ساختیاتی اور متنی حوالے سے اس پر سوچ بچار کیا۔

امتیاز علی خان عرشی اردو کے شاعر، نقاد اور محقق تھے۔ ان کا عربی اور فارسی ادبیات کا بہترین مطالعہ تھا۔ اساسی طور پر وہ متنی نقاد تھے۔ ان کی تحریریں متنی نظرئیے کے حوالے سے ایک بھرپور سیاق اور پس منظر کی حامل ہوتی ہیں۔

ساختیات کے متنی رسائی ادبی متن کی تدوین اور ترتیب دینے کے بعد کے تحت قدیم مخطوطات اور نصوص کی بازیافت جن کی علمی، ادبی اور تاریخی اہمیت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر الطاف حسین نقشبندی نے لکھا ہے ''انھیں منشائے مصنف کے مطابق ترتیب دینا تدوین کہلاتا ہے۔'' منشائے مصنف کے مطابق متن کو ترتیب دینے کے کچھ اصول و آداب ہیں اور بہت سے مسائل کا سامنا کرنا

پڑتا ہے۔ ان سے عہدہ بر آ ہونے کے بعد ہی کوئی مرتب کسی متن کو اچھی طرح ترتیب دے سکتا ہے۔ کسی بھی متن کو مرتب کرنے کے لئے سب سے پہلے مواد کا فراہم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں پہلا یہ کہ وہ ایک جگہ موجود ہو دوسرا یہ کہ بکھری ہوئی حالت میں ہو۔ مثلاً کسی کا دیوان ہے یا تذکرہ یا پھر لغت ہے تو بس اس کا طریقہ یہ ہے کہ اصل مخطوطے سے اس متن کو نقل کر لیا جائے۔ مخطوطے کی بھی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ جیسے خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا، یا اس کا اصلاح کیا ہوا، یا کم از کم اس کی نظر سے گذرا ہوا۔ اس سے مختلف صورت یہ ہے کہ کسی متعلق یا غیر متعلق شخص نے مخطوطے کی کتاب کی ہو اور یہ مصنف کی نظر سے نہ گذرا ہو۔ پہلی صورت میں مصنف متن سے متفق ہو گا لیکن دوسری صورت میں نہیں۔ اس میں نقاد یا محقق کو عقل سلیم سے کام لینا چاہئے۔ جو ناقد یا محقق کو 'نقاد کی اساس تنقیدی' نظریے کے زیر اثر آ جاتا ہے۔ مگر نقد نگار اور محقق کو زیادہ موضوعی نہیں ہونا چاہے اس کو معروضی بھی ہونا چاہیے۔ تمام ممکن الحصول نسخوں اور ان کے ذیلی متعلقات کی دستیابی تدوین متن کا بنیادی لازمہ ہے۔

غالب اور امتیاز علی خان عرشی

امتیاز علی خاں عرشی کا اولین متنی کارنامہ 1937 میں 'مکاتیب غالب' کے نام سے سامنے آیا اور کوئی چھ سال بعد 1943 میں ''انتخاب غالب'' کا نصوصی/ متنی تدوینی کارنامہ چھپ کر قارئین کے ہم دست ہوا۔ یہ مرزا غالب کے اردو اور فارسی کا انتخاب تھا۔ جو غالب نے 1866 میں نواب رام پور کلب علی خان کو پیش کیا تھا۔ اور 1944 میں شاہ عالم چانی کے فارسی، برج بھاشا اور اردو دیوان ''نادرات شاہی'' کی انتقادی جلد شائع ہوئی۔

تحقیق و تدوین کا کام جس دیدہ ریزی اور جگر کاوی کا مطالبہ کرتا ہے امتیاز علی خاں عرشی اس پر پورے اترتے ہیں۔ اس تیز رفتاری اور سہل پسندی کے دور میں ان کے معیار کے بلند پایہ عالم اور محقق نایاب ہیں۔ ان کی ساری زندگی تحقیق و تصنیف کے کام میں بسر ہوئی، عرشی صاحب نے تصنیف و تالیف کی ابتدا اپنی تعلیم کے زمانے سے ہی پنجاب یونی ورسٹی میں کی۔ کچھ دنوں کے بعد رام پور ریاست کی عظیم الشان رضا لائبریری سے وابستہ ہو گئے، عربی فارسی انگریزی زبانوں سے گہری واقفیت کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کرتے تھے۔ لیکن ان کا اصل میدان تحقیق و تدوین ہے۔ عرشی صاحب نے تحقیق کے میدان میں کار ہائے نمایاں انجام دئے۔ خاص طور سے غالبیات میں انھوں نے بہت اضافے کئے۔ مثلاً یوسف علی خان ناظم اور نواب کلب علی خاں کے نام غالب نے جو خطوط لکھے تھے، وہ رام پور کے دار الانشاء میں محفوظ تھے۔ عرشی صاحب نے ان خطوط کو ''مکاتیب غالب'' کے نام سے مرتب کیا اور 183 صفحات پر مشتمل طویل مقدمہ کے ساتھ 1937 میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ فارسی اور اردو پر مشتمل ایک کتاب ''انتخاب غالب'' کے نام سے شائع کی۔ اس کتاب کا دیباچہ عرشی صاحب کی محققانہ علمیت کا مظہر ہے۔

غالب نے اپنے کلام میں بعض ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جو انھیں سے مخصوص تھے یا فارسی و اردو کے مشکل الفاظ کا استعمال کیا ہے جسے عام قاری سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ لہٰذا عرشی صاحب نے ایک اہم کام یہ کیا کہ غالب کی اردوئے معلیٰ، عود ہندی، ابر گہر، انتخاب غالب، پنچ آہنگ، تیغ تیز، دستنبو، قاطع برہان اور غالب کی دوسری تخلیقات کی مدد سے انھوں نے فرہنگ تیار کی۔ جو 1947 میں ''فرہنگ غالب'' کے نام سے شائع ہوئی۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ غالب شناسی میں عرشی صاحب کا ایک نمایاں کارنامہ ''دیوان غالب نسخہ عرشی'' کے نام سے بھی ہے۔ اس نسخہ میں غالب کے اردو کلام کو تاریخی ترتیب سے پیش کیا ہے۔ اس کے تین حصے ہیں پہلے حصے کا عنوان ''گنجینہ معنی'' ہے۔ اس میں غالب کے ابتدائی زمانے کا کلام ہے۔ دوسرے حصے کا نام ''نوائے سروش'' ہے۔ اس حصے میں وہ اشعار ہیں جو غالب کی زندگی میں کئی بار چھپ چکے تھے۔ تیسرے حصے کا نام ''یادگار نالہ'' ہے اس حصے میں غالب کے وہ اشعار ہیں جو متداول دیوان میں شامل نہیں ہیں۔ یہ وہ اشعار ہیں جو غالب کے دیوان کے کسی نسخے کے حاشیہ یا خاتمے یا کسی بیاض یا کسی خط میں موجود تھے۔ اس نسخے کے تینوں حصوں کے نام غالب کے اشعار سے ہی ماخوذ ہیں۔ ایک بار اس نسخے کے شائع ہونے کے بعد عرشی صاحب نے دوسری بار کی طباعت میں مزید چھان بین اور تلاش و جستجو کر کے نئے مآخذ کا استعمال کر کے اختلاف نسخ کو نہایت جامع انداز میں پیش کیا ہے۔

اس لحاظ سے نسخہ عرشی دوسرے تمام نسخوں کے مقابلے صحت متن اور اپنے مقدمہ کے اعتبار سے قابل قدر ہے۔ اس کا مقدمہ بہتر 72 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس بسیط مقدمے سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس نسخہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں منشائے مصنف کا حتی الامکان لحاظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً غالب پاؤں کو پانو لکھتے تھے، خورشید کو خرشید، اور ذال والے لفظ کو 'ز' سے لکھتے تھے چنانچہ عرشی صاحب نے غالب کے اس مخصوص طرز کو مد نظر رکھا ہے۔

اپنے اسی مضمون میں محمد سعید صاحب نے نسخہ عرشی کے متعلق ایک اور رائے دی ہے جس میں اس نسخہ کے مشکوک

ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔
’’---- -- غالب چونکہ بعض الفاظ کے املا کے بارے میں اپنی منفرد رائے رکھتے تھے اور اپنی تحریروں میں اس کی پابندی بھی کرتے تھے۔ اس لئے جس طرح اصول تدوین کے مطابق متن کو منشا کے مصنف کے مطابق پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح املا بھی مصنف (خصوصاً غالب) کے منشا کے مطابق درج کرنا چاہئے اس لحاظ سے دیکھیں تو نسخہ عرشی طبع اول یا طبع ثانی دونوں میں غالب کے املا کی مکمل پیروی نہیں کی گئی جو اصول تدوین کے خلاف ہے۔‘‘ صائمہ پروین نے لکھا ہے "اس نسخے میں غالب کے کلام کو غالب کی منشا کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو کہ تدوین کا پہلا اصول بھی ہے۔ مولانا نے خود اپنے مقدمے میں وضاحت کی ہے کہ املا اور رسم الخط کے معاملے میں موجودہ اصول اور غالب کے اختیار کردہ اصول دونوں سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً غالب کا یہ اصول مشہور ہے کہ وہ ’خورشید‘ کو بحذف ’و‘ یعنی ’خرشید‘ لکھتے تھے۔ چنانچہ مولانا نے بھی اس نسخے میں ’خرشید‘ ہی لکھا ہے۔ مثلاً نسخۂ عرشی حصۂ قصائد میں صفحہ نمبر 7 کے چوتھے شعر میں لفظ ’خورشید‘ آیا ہے اور اس کو مولانا نے ’خرشید‘ لکھا ہے۔ شعر اس طرح ہے:

درست اس سلسلۂ ناز کے، جوں سنبل و گل
ابر میخانہ کریں ساغر خرشید شکار

اسی طرح غالب پاؤں کو پانو لکھتے تھے۔ ’ذ‘ لکھنا غلط قرار دیتے تھے اور اس کی جگہ ’ز‘ لکھتے تھے مثلاً زرا، گزر، رہگزر، گزارش وغیرہ۔ چنانچہ نسخۂ عرشی میں ان جیسے الفاظ غالب کی منشا کے مطابق لکھے گئے ہیں۔ مگر کہیں کہیں اس اصول سے انحراف بھی نظر آتا ہے۔‘‘ امتیاز علی عرشی نے غالب کی آخری اصلاح کی بجائے اپنی خوش ذوقی کی بنیاد پر بھی ترتیب دیا ہے۔ یہ بات تدوین متن کے اصولوں کے خلاف ہے۔ کلام غالب کے حوالے سے یہ بات اور بھی اہم ہے کیونکہ غالب آخری عمر تک اپنے کلام کی ترمیم و اصلاح کرتے رہے اس لئے غالب کے آخری نسخہ کی اصلاح کو مد نظر رکھنا چاہیے تھا مگر عرشی نے اس اصول سے انحراف کیا ہے۔ اس سلسلہ میں نسخہ عرشی سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے:

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے

نسخہ رامپور میں اس کا پہلا مصرع اس طرح ہے:
ہے زلزلہ و صر صر و سیماب کا عالم
’’دیوان غالب: "نسخہ عرشی" کا تجزیاتی مطالعہ، ہم سب 27 مئیء 2021۔ انٹرنیٹ}
عرشی صاحب کے تحقیق و تدوین کا ایک بہترین نمونہ احمد علی یکتا کی دستور الفصاحت ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں انھوں نے بہت سی معلومات یکجا کی ہیں۔ جو ان کے وسیع مطالعے کے ضامن ہیں۔ کڑی محنت و ریاضت کا ثبوت بھی۔ شاہ عالم ثانی کے اردو فارسی اور ہندی کلام کو ’’نادرات شاہی‘‘ کے نام سے شائع کیا۔ اس کتاب کا بھی دیباچہ بہت ہی علمی ہے۔ عرشی صاحب کے نادر و نایاب کتابوں کے ذخیرہ میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔ اس سے ہمیں شاہ عالم ثانی کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔
انشاء اللہ خان انشاء کی مختصر کہانی سلک گہر کو بھی عرشی صاحب اپنے دیباچے کے ساتھ 1948 میں اسٹیٹ پریس رام پور سے چھپوایا، محاورات کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس میں بیگمات کے محاوروں کو جمع کیا ہے۔ خان آرزو کی ’’نوارد الفاظ‘‘ میں خواتین کے محاورے اور الفاظ نقل کئے گئے تھے۔ سعادت یار خاں رنگین نے بھی ’’دیوان ریختی‘‘ میں بیگمات کے محاوروں کو جمع کیا تھا۔ عرشی صاحب نے ’’دیوان ریختی‘‘ اور ’’نوادر الفاظ‘‘ کو سامنے رکھ کر ’’محاورات بیگمات‘‘ ترتیب دی۔ اس کے علاوہ عرشی صاحب نے کئی عربی کتابوں کے اردو میں ترجمے کئے اور مخطوطات کو بھی مرتب کیا۔

امتیاز علی خان عرشی کا" نہج البلاغہ "کا معرکۃ آرا متنی تحقیق اور تدوین

عرشی مرحوم کے سائنسی کام کے بارے میں بات کرتے ہوئے، ہمیں نہج البلاغہ پر تحقیق کی نظر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس

کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ قدیم زمانے سے ہی کچھ سنی علمائے کرام نے سید رضی کی طرف سے اس تصنیف پر سوال اٹھائے تھے، اور اس کے علاوہ بہت سے لوگوں کو شبہ تھا کہ جمع شدہ الفاظ بنیادی طور پر علیؑ ابن ابی طالب کے اقوال تھے۔ معاصر دور میں 1330ھ کی دہائی کے آس پاس شکوک و شبہات اپنے عروج پر پہنچ گئے، اور مصری مصنفین، جیسے احمد امین وغیرہ، نے اس کام کے متن پر تنقید کرتے ہوئے ثبوت فراہم کرنے کی کوشش کی، جس سے معلوم ہوا کہ علی ابن ابی طالب حوالے سے جو کچھ لکھا گیا، اس کے کچھ حصے جعلی تھے صدیوں کے بعد بھی اس پر تحقیق کی گئی نہ کچھ سوچا گیا۔
نہج البلاغہ کی صداقت کے دفاع کے لئے شیعوں کے ذریعہ لکھی گئی ایک اہم کتاب، نہج البلاغہ کو امتیاز علی خان عرشی نے بڑی عرق ریزی کے بعد اس کی قرات نو کی۔ اس کام میں، وہ نہج البلاغہ کی ایک مستند دستاویز کی کوشش کرتے رہے۔
دوسرے لفظوں میں سید رضی نے نہج البلاغہ کے بیان کردہ دستاویزات کو مستند دستاویز کی صورت میں پیش کیں مگر انہوں نے اپنے ذرائع اور ماخذات کا بیان نہیں کیا۔
اس سے قبل مرزا حبیب اللہ کھوئی نے نہج البلاغہ پر منہاج البرقہ کے عنوان سے اپنی تفسیر میں نہج البلاغہ کو دستاویز کرنے کی کوشش کی تھی۔ دیگر علمائے کرام، جیسے حبہ شاہین شہرستانی، ہادی الکاشف الغتہ، وغیرہ نے کچھ کام کیا تھا، لیکن امتیاز علی خان عرشی نے انتہائی سائنسی، منطقی اور سنجیدہ طریقے سے بیاں کرنے کی کوشش کی۔ جدید عہد کے علوم سے واقفیت کی وجہ سے انہوں نے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ سائنسی فکر اور اسلوب اور طریقہ کار کی مدد سے اپنی اس تحقیق کو شفاف اور استدلالی بنایا، اس سلسلے میں عرشی صاحب نے بڑے بڑے کتب خانوں اور ذرائع اور ماخذات حاصل کئے۔
امتیاز علی خان عرشی نہج البلاغہ میں علیؑ ابن ابی طالب سے منسوب کل تقاریر کے 106 خطبات، 37 خطوط اور 79 مختصر الفاظ دستاویز جمع کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انہوں نے پہلے اپنے اس تحقیق اور تدوینی کام کو ہندوستانی ثقافت میگزین میں بطور مضمون شائع کروایا اور بعد میں اضافوں کے ساتھ آزادانہ طور پر چھاپا گیا۔ اس کام کو عربی سے فارسی میں ان کے ایک معاون عامر انصاری نے ترجمہ کیا، اور نہج البلاغہ کے حوالہ سے، مرتضیٰ آیت اللہ زید شیرازی نے عربی سے فارسی میں، ترجمہ کیا۔ اس کام کا فارسی ترجمہ ڈیجیٹل کتب خانے میں دستیاب ہے۔
1943 میں اردو کے نقطہ نظر سے ”دستور الفصاحت" شائع ہوئی۔ انھوں نے 1926 میں ”تاریخ اکبری المعروف بہ تاریخ قندھاری“ مرتب کی۔ جو 446 صفحات پر مشتمل ہے یہ عہد اکبری کے درباری تاریخ ہے۔ عرشی صاحب کو اس کے دو ہی نسخے ملے۔ اس کا ایک نسخہ رضا لائبریری اور دوسرا نسخہ کیمرج میں محفوظ ہے۔ انھوں نے ان دونوں نسخوں کو سامنے رکھ کر یہ جلد تیار کی۔ 1960 میں امتیاز علی خان عرشی نے 338 صفحات پر مشتمل مرزا محمد حارثی بدخشی دہلوی کی تاریخ کے موضوع پر ”تاریخ محمدی“ لکھی۔ حارثی نے ایک ہجری سے 1161ھ تک کے مشاہیر کی وفیات مرتب کی تھی۔ عرشی صاحب نے میر علاءالدین قزوینی کا ’تذکرہ نقائس المآثر‘ اور مرزا خان بن فخر الدین احمد کی کتاب " تحفہ الہند" کے تنقیدی جلدیں بھی تیار کئے گئے۔ جو عرشی صاحب کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکے۔
۔ *امتیاز علی خان عرشی نے شاعروں اور ادیبوں سے متعلق تحقیقی مقالات بھی لکھے ہیں: ۔ *
سودا کا ایک قصیدہ اردو ادب علی گڑھ 1950
خطوط داغ، اردو ادب علی گڑھ ستمبر 1952
آنند رام مخلص کے اردو شعر، معاصر پٹنہ حصہ 1مئی 1951
مومن کا کلام فارسی۔ پگڈنڈی، امرتسر جنوری 1960
ناسخ کے دفتر پریشاں کا بیش قیمت سودہ۔ قومی زبان کراچی مئی 1979
***

مصحف اقبال توصیفی کی شاعری: ایک منجمد پُر شور دریا --- اسلم عمادی

اُردو کی نئی شاعری اِس معاملے میں بہت خوش بخت ہے کہ اس کے دامن میں کئی نمائندہ اور قابل ذکر شاعر اپنے اپنے منفرد لب و لہجہ (زبان، ڈکشن اور فکر) کے ساتھ رونق پذیر ہیں۔ یہ شاعر ہندوستان، پاکستان اور دوسرے ممالک میں رہتے ہوئے بھی ایک حد تک اسی فکری لہر سے اِرتباط رکھتے ہیں جو جدید شاعری کی شناخت ہے۔ ایسے ہی ایک اہم شاعر جناب مصحف اقبال توصیفی بھی ہیں۔ ہند و پاک میں جب بھی جدید شاعری کی بات ہو گی تو اِس میں اہم ترین ناموں میں مصحفؔ کا ذکر ضرور آئے گا۔

مصحفؔ نے شاعری کو سراسر اِظہار ذات کے وسیلے کی طرح استعمال کیا ہے وہ اپنی سوچ کی ترسیل کے لیے ارتکاز کے ساتھ ایک مخصوص ڈکشن کو پسند کرتے ہیں اور یہی ڈکشن ان کی شاعری کی پہچان ہے۔

ان کی شاعری کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ آپ ایک مانوس سے ماحول میں آ گئے ہیں، جہاں کے سارے کردار کچھ جانے پہچانے سے ہیں لیکن جہاں کے موسم اجنبی اور جداگانہ سے ہیں، یہ تحیر آمیز صورت حال مصحف نے غضب کی فن کارانہ صلاحیت سے پیدا کی ہے۔

مصحفؔ کی شاعری کی اہم ترین قوت ان کی صداقت ہے وہ جذبات کے اظہار کے لیے کوئی غیر معمولی فطری ماحول نہیں گھڑتے بلکہ کچھ حد تک راست طور سے لیکن شاعرانہ تیور سے اپنا اصل مقصود بیان کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں اور غزلیں دونوں ہی اس معاملے میں ان کے ذاتی تجربات، ذاتی شعور اور قریب ترین ماحول سے متعلق ہیں۔ اس لحاظ سے مصحفؔ کی شاعری بنیادی طور پر دونوں ہی فارم (نظم اور غزل) میں اپنی جداگانہ تخصیص رکھنے کے باوجود خلوص اظہار پر مرکوز ہیں۔ پھر بھی دونوں ہی اصناف میں ان کے دو بے حد الگ اور واضح طرز بیان سامنے آئے ہیں۔ جہاں ان کی نظمیں، بیش تر نیم مکالماتی یا خود کلامی یا بیانیہ میں سے کسی ایک لہجہ کو استعمال کرتی ہیں ان کی غزل سراسر شاعرانہ، سہل ممتنع اور راست اور کچھ حد تک روایتی انداز پر مائل ہے۔ ندرت تو ہے لیکن تجربہ اور علامتی اظہار (جو کہ جدید شاعری کا رویہ ہے) کا کم ہی تناسب ملتا ہے۔

ایک اور بات جو مصحف کی شاعری کو ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ عمیق، گنجلک اور مجہول موضوعات سے شاعری کو بوجھل، دور افتادہ یا نارسا بنانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے شاعر آپ سے قریب تر ہے، وہ آپ کا شریک سفر ہے، وہ آپ کو وہ باتیں سناتا ہے جس سے آپ شاید مانوس ہیں لیکن ان کی پرتیں اور ان کی زیریں رو کی نشان دہی بھی کرتا ہے جو آپ کے لیے شاید نئی ہوں۔ کچھ حد تک ناصر کاظمی اور خلیل الرحمن اعظمی نے شاعر کے جس (Role) رول کے بارے میں اشارہ کیا تھا وہی منصب یا رول (زیرک فکر کے امتزاج کے ساتھ) مصحف نے نبھایا ہے۔

ان کی نظمیں متوسط طول کی بلکہ کچھ حد تک مختصر طوالت کی ہوتی ہیں کسی موضوع کے ساتھ دیر تک، دور تک اور تکرار کے ساتھ چلنے سے گریز کیا گیا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ شاعر موضوع کو برتنے کے لیے سطحیں تبدیل کرتا ہوا، پرتیں کھولتا ہوا، زاویے بدلتا ہوا، انحراف یا گریز کرتا ہوا طویل فکری اظہار کی طرف مائل ہو۔ اس کے لیے مختصر لمحہ کا اظہار زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ ایسے ہی کئی مختصر لمحے مل کر طویل زندگی کی آئینہ داری کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے ان کی نظموں میں عام طور سے مکالماتی (بلکہ نیم مکالماتی کہوں تو بہتر ہے) انداز کو منتخب کیا گیا ہے۔ شاعر عموماً اپنے کردار کے تعارف کے لیے اس کے اطراف و اکناف اور احباب سے تعلق و نسبت کو اجاگر کرتا ہے۔ ان نظموں میں کچھ حد ایک نا محسوس قسم کی کردار نگاری بھی ملتی ہے۔ یہ کردار بیش تر رائج الوقت اور ہم عصر (Contemporary) سماج کی تمثیل کی طرح ہیں۔ شاعر اس کردار کو اس کے لب و لہجے اور Approach کے تناظر میں پیش کر کے نئی زندگی کی عکاسی کرنے کی کوشش کرتا ہے یہ عکاسی بالکل صریح اور راست بھی نہیں بلکہ کئی مائل سطحوں سے ہو کر ایک مقصود منظر کو پیش کرتی ہے۔

غزلوں میں جہاں شاعر نے سہل ممتنع طرز بیان کو ترجیح دی ہے وہیں ان کا ہر شعر واضح اکائی کی طرح ایک خاص موضوع کا اظہار ہے۔ شعر کی زبان میں ایک خفیف سی پیاس، ایک غیر متوقع اچانک پن اور محتاط طور پر لفظوں کا انتخاب اور عام طرز سے ہلکا سا اعراض ان کی غزلوں کو جدید غزلوں میں ایک بین شناخت فراہم کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں کی سب سے اہم جہت ”غزل پن“ ہے۔ ان کے موضوعات میں ”ہم تم“ کا تذکرہ (کچھ حد تک رومان)، ہم سفری کے تجربات، وقت گزاری کے اشغال اور ذاتی مشاہدات بہ درجہ اتم موجود ہیں۔ چند شعر اس ضمن میں:

تو بھی مجھ سے روٹھی تھی
میں اِک کروٹ لیٹا تھا

محفلوں میں کم نظر آتا ہوں میں
اپنی تنہائی سے گھبراتا ہوں میں

یہ آئینہ خانہ کیا کروں میں
میں تجھ کو کہاں رکھوں چھپا کر

ذرہ ذرہ مری لاکھوں آنکھیں
لمحہ لمحہ ترا جادو ہوتا

میری آنکھوں کے دروازے پر دستک دی
سوتے ہوئے اک غم کو جگایا کس نے؟ تم نے!

بھیڑ تھی کیسی دوکانوں پر!
کوئی نہ پہنچا اپنے گھر تک!

رات تم نے روشنی کے کھیل میں
کیوں مرے سائے پہ سایہ رکھ دیا

چار سو میں نے بچھا دیں آنکھیں
ہر طرف تو، تھی، نظارے تیرے

مصحفؔ کا الفاظ سے رشتہ خالص طور پر ترسیل کے تناظر میں ہے، وہ لفظ کو ایک آلہ کی طرح (بلکہ ایک زنجیر کی کڑی کی طرح) اِستعمال کرتے ہیں، یہ آلہ سراسر اِکہرا نہیں ہے، وہ ہر لفظ کو ایک منتخب سطح سے متشرح کرتے ہیں، کبھی وہ مناظر کو نیم باز حد تک کھولتے ہیں یا کبھی ان میں ایسا رنگ بھر دیتے ہیں جو نئی معنویت بخشے، جس سے ایک غیر عمومی حساس فضا پیدا ہو جاتی ہے ایسی فضا جو ہر غیر مرئی لہر سے اہتزاز انگیز اور مرتعش ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ نجی زندگی کے کسی تجربے کو شاعر وسعت دے کر ایک عالمی تجربہ میں بدل دینا چاہتا ہے اور وہ بھی یوں کہ نجی محسوسات ضائع نہ ہوں۔

مصحفؔ کی شعری زبان ان کی نظموں میں بہت حد تک نثری بیانیہ اسلوب میں ہیں جن میں مجید امجد اور اختر الایمان کی نظموں جیسا کھردرا پن ہے۔

لب و لہجہ میں پُر فریب لفاظی اور نرم و شیریں تراکیب سے احتراز کیا گیا ہے تاکہ بات حقیقت سے بعید نہ ہو پائے اور اسی ارکاز سے ترسیل ہو جس کو شاعر مرغوب سمجھے۔ نظموں میں ایک عمومی زندگی سے منتخب مناظر اور علامتیں پیش کیے گئے ہیں جو قریب تر محسوس ہوں مثلاً چائے، نکڑ، کافی ہاؤس، گیند، کھلونا، شیو (Shave)، سگریٹ، ریل، کھانے کی میز، ممی پپا، مائیکرو فلم، اسکوٹر وغیرہ۔

جیسا کہ میں نے اس سے پہلے ایک مضمون میں اشارہ کیا تھا، مصحف کی نظموں میں وقت ایک اہم رکن ہے، وہ وقت پل پل سے لیکن صدیوں تک ناپتے ہیں۔ اس کے علاوہ، وہ تراکیب اور بندشوں میں ایک طویل بیان کو محو اور منجمد کر دیتے ہیں۔

ان کی نظموں میں ذاتی کرب کو کلیدی اہمیت حاصل ہے، فرد کی گرسنگی، دوستوں کے بچھڑنے کا غم، معصوم زندگی سے دور ہو جانے کا الم، رشتوں میں مثبت و منفی تعلق، اظہار و ترسیل کے مسائل اور ایسے ہی کئی اہم موضوعات ہیں جو ان کی نظموں میں خصوصیت سے ملتے ہیں۔

مصحفؔ کی نظموں کے ماحول اور کردار دونوں ہی متوسط درجہ کے سماج سے منتخب شدہ ہوتے ہیں، اس لیے آپ کو ان کا کلام پڑھتے ہوئے نامانوسیت کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کی نظموں کے چند گوشے نموناً پیش ہیں:

’’تم بڑے چالاک ہو
اور سفاک بھی
تم چاہتے ہو
میں اپنے ہونٹوں کی سیپیاں ضرور کھولوں
اپنے سینے کے راز
ایک گٹھری میں باندھ کر
تمھاری چوکھٹ پر رکھ دوں ---‘‘

(مجھے شاعری نہیں آتی)

’’میں ترے کرتے کا دامن تھاموں
آؤ ہم ریل بنائیں ---
آؤ ہم ریل کو پیچھے لے جائیں ---‘‘
(وقت کی ریل گاڑی)

’’ہوش میں آؤ --- ہم کو
وقت کے دھارے پر بہنا ہے
ہم کو ان لوگوں میں
اس دنیا میں رہنا ہے‘‘
(بند دروازے)

’’پھر ایک نرم ہوا کا جھونکا
اور منظر نے کروٹ لی
میرے جسم کے گملے میں اظہار کا پردا
ایک ٹہنی پر نطق کا پھول اپنی پلکیں جھپکاتا
پنکھڑیوں کی اوٹ سے آنکھیں کھول رہا تھا!!
(تو خاموش تھی)

مصحفؔ کی نظموں کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ایک بے حد حساس، دردمند اور بے لوث زندگی کا شاعر آپ سے ہم کلام ہے۔ وہ فرد کے قریب تر مسائل سے گہرے طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ وہی معصوم زندگی کی رعنائیوں کے شائق ہیں۔ مصحفؔ نے اصولوں، عقائد اور اس قسم کے ناصحانہ موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ نہیں دی ہے لیکن ان کی تخلیقات کے پس منظر سے ایک ایسا فرد احساس پر ابھرتا ہے جو صالح سوچ، متوازن زندگی اور سادہ طرز حیات کی تجسیم ہے۔ آپ مصحفؔ کے کلام کے مختلف ادوار سے گزریں گے تو یہ ضرور محسوس کریں گے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ان کی شاعری کے تار و پود کی زیریں رو میں آہستہ آہستہ ایک نمائندہ تبدیلی بہت حد تک زندگی کی بدلتی ہوئی روش اور شاعر کے خالص تجربات حیات کے اِکتساب سے منتج ہوتی ہے۔

وہی شاعر جو اِبتدائی دور میں چاہتوں، دوست داریوں اور کار جہاں کی جہد میں مصروف ملتا ہے اب حقائق سے روشناس ہو کر غیر رومانی فلسفیانہ صداقتوں سے دوچار ہے اور بکھرتی ہوئی زندگی کو سمیٹنے کے لیے کوشاں ملتا ہے اور کمال یہ کہ دونوں ادوار میں اسلوب کی مخصوص انفرادیت قائم ہے۔

بلاشبہ مصحفؔ اقبال توصیفی جدید شاعری کا ایک اہم نام ہے اور ان کی شاعری ایک منجمد لیکن پرُ شور دریا کی طرح ہے کہ رواں ہو جائے تو سیل در سیل اپنے مخاطب کو بہا لے جائے، اپنی جاری و ساری حسیت کی لہروں پر!

***

مشتاق دربھنگوی کی یاد میں --- ڈاکٹر عطا عابدی

مشتاقؔ دربھنگوی سے میری ملاقات محلہ املی گھاٹ (دربھنگہ) میں ہوئی تھی، جہاں میرا قیام ہوا کرتا تھا۔ یہ غالباً 1982-83ء کی بات ہے۔ اُنہوں نے اپنے شعری مجموعہ ’’غمِ جاناں‘‘ سے نوازا۔ ’غمِ جاناں‘ کی شاعری غمِ جاناں سے عبارت تھی۔ اُس وقت اُن کی نوجوانی کا عالم تھا، میں خود بھی طفلِ مکتب تھا (آج بھی طفلِ مکتب ہی ہوں) اور یہ شاعری اچھی لگی تھی۔ مجموعہ کا سائز اور انداز ’’حلقۂ فکر و فن‘‘ کے گلدستہ ’’وادیِ نشاط‘‘ جیسے تھے۔ اُس وقت وہ اپنی رومانی شاعری سے

مطمئن نہیں تھے۔ اُن کے ذہن و دل میں فکر و فن کے کچھ الگ حوالے کسمساتے رہتے تھے۔ وہ اِس کسمساہٹ کو کوئی نام نہیں دیتے تھے لیکن اِس کیفیت کے سبب اچھے سے اچھا لکھنے کے عزم کا اظہار ضرور کرتے۔ اُن کی غزل کا مطلع دیکھیں:

کیا ضروری ہے کہ ہر بات پہ آنسو نکلے
جیسے ہر پھول سے ممکن نہیں خوشبو نکلے

اس ملاقات کے بعد ’’حلقۂ فکر و فن‘‘ کی نشستوں میں اُن سے ملاقاتیں رہیں۔ شعر و شاعری کا دور رہا اور اب اُن کی غزلوں میں غمِ جاناں سے زیادہ غمِ دوراں کی صورت نظر آتی ہے۔ اُسی دور کے آس پاس وہ کسی مقامی کالج میں انسٹرکٹر کے طور پر کام کرنے لگے تھے۔ برسوں اس ذمہ داری سے وابستہ رہنے کے بعد جب اقتصادی مسائل کے حل کی اُمید نہ رہی تو اُنہوں نے اپنی فکر و صلاحیت کے بموجب صحافت کو پناہ گاہ بنائی۔ صحافت کی راہوں میں قلمی و تکنیکی خدمات کے ساتھ ساتھ اُن کا ادبی مشغلہ جاری رہا۔ اس مشغلہ میں اُنہوں نے اپنے جنون کو شامل کر لیا اور پھر اردو ادب کی خدمت کا بالکل نیا اور منفرد طور اپنایا۔ متنوع عنوانات کے تحت کتابوں کی ترتیب و تہذیب کے سبب وہ دور دور تک اپنے نام اور کام کو منوانے میں کامیاب ہوئے۔ اس ضمن میں شمع فروزاں، سمندر کی لہریں، ہنسی کے پھول، پہیلیاں، اقوالِ زریں، میر بھی ہم بھی، لا الہ الااللہ، صل علیٰ محمدؐ، اسوۂ رسولؐ، جانِ غزل، عندلیبان طیبہ، غزالانِ حرم، لوریاں، گوش بر آواز اور اردو شاعری میں زمزم کتابیں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

مشتاقؔ دربھنگوی شاعری میں مشہور ترقی پسند شاعر و ادیب اویس احمد دوراںؔ سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ اُن دنوں میں بھی دوراںؔ صاحب سے شاعری پر اصلاح لیا کرتا تھا، لہٰذا ہم دونوں ایک دوسرے سے ذہنی لگاؤ محسوس کرتے تھے۔ مشتاقؔ دربھنگوی کئی ادبی انجمنوں سے وابستہ رہے۔ ان کے گاؤں چندن پٹی کی ’’ادبی مجلس‘‘ ہو یا ’’حلقۂ فکر و فن‘‘ یا اور کوئی انجمن، وہ ہر جگہ اپنی شرکت سے اپنے ادبی ذوق و شوق کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔ کولکاتا جانے کے بعد اُن کے اشہبِ ذوق کو پَر لگ گئے اور نئی سمت و رفتار کے ساتھ قلمی سفر طے کرتے رہے اور ایک منفرد شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔

’’غمِ جاناں‘‘ کے بعد مشتاقؔ دربھنگوی کا شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ یہ مختصر مجموعہ بھی اب نایاب ہے۔ یہ مجموعہ ہوتا تو معلوم ہوتا کہ اُن کی شاعری اس وقت کس فکر و انداز کی حامل تھی۔ اُن کی ابتدائی غزلیں جیسا کہ قبل ذکر آیا، رومانوی جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتی تھیں:

یاد ہے اب تک نظر کا زلف و رُخ سے کھیلنا
دل میں تازہ ہے بہارِ عشرتِ رفتہ ابھی

چھپا رکھا تھا رازِ عشق میں نے اپنے سینے میں
مگر ہو ہی گئی سب کو خبر آہستہ آہستہ

اُن کی دو چار غزلیں جو حال میں مختلف جگہوں پر نظر سے گزریں، وہ متذکرہ غزلوں کی فکر سے الگ ہیں۔ ان غزلوں میں عصری شعور کے جلوے ہیں، وقت کی آوازیں ہیں، حیات کے بصیرت افروز اشارے ہیں اور دعوتِ فکر دیتے ہوئے حقائق بھی۔ ان سب کے باوجود جمالیاتی افکار و اطوار کی ادائیں گُم نہیں ہوئی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اب ان اداؤں میں زندگی کے سنجیدہ تیور بھی جگہ رکھتے ہیں۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تشنگی میری بھلا کیسے بجھاتا دریا
سامنے تھا جو مرے پیاس کا مارا دریا
آپ نے خونیں مناظر کے سنے ہیں قصّے
میری آنکھوں نے تو دیکھا ہے لہو کا دریا
صحرا صحرا اُسے جب ڈھونڈ کے ہم ہار گئے
پھر اُسے ڈھونڈتے پھرتے رہے دریا دریا

یہ سچ ہے کہ ایک غزل سے کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا لیکن ابتدائی غزلوں کے رنگ و آہنگ سے بعد کی غزلیں کس قدر واضح طور پر الگ ہیں، یہ آسانی سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ امید ہے، اطلاع کے بموجب مشتاقؔ دربھنگوی کا شعری

مجموعہ عنقریب منظر عام پر آئے گا اور اُنہیں منفرد شعری شناخت عطا کرے گا۔
***

مظفر حنفی مرحوم ... چند یادیں، چند باتیں ... ڈاکٹر محمد نعمان خاں

مظفر حنفی صاحب شعبہ اردو سیفیہ کالج کے طالب علم رہے ہیں لیکن ابتدا میں ان سے زیادہ قربت کا شرف اس وجہ سے حاصل نہیں ہو سکا کہ جب میں نے ۱۹۷۱ء میں سیفیہ کالج میں بی اے سال اوّل کے لیے داخلہ لیا، وہ ایم اے کی تعلیم مکمل کر چکے تھے۔ البتہ شعبہ ارد ومیں آنے والے رسائل میں ان کی تخلیقات کے مطالعے نیز بھوپال یونیورسٹی سے گولڈ میڈل حاصل کرنے کی خبر سے غائبانہ طور پر متعارف ہوا۔ عام روش سے ہٹ کر ان کے تیکھے اور طنز آمیز کلام سے محظوظ ہوتا رہا۔ استاذی محترم عبدالقوی صاحب دسنوی کی زبانی کلاس میں ان کی کامرانیوں کے قصّے سنتا رہا۔ وہ یہ باتیں اس لیے بتاتے تھے تاکہ دوسرے طلباء بھی مظفر حنفی جیسے بن جائیں۔ ۱۹۷۴ءیے میں مظفر صاحب کی پی ایچ ڈی Viva کے بعد شعبہ اردو سیفیہ کالج میں Viva Expert ڈاکٹر سید اعجاز حسین کے اعزاز میں منعقدہ ادبی جلسہ میں جب ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو نحیف و نزار جسم، دبی رنگت، پتلا چہرہ، نکلتا قد، قدرے گھنگھرالے مگر چھوٹے بال، ستواں ناک پر سفید چشمے کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی متجسس ذہین آنکھوں کی حامل سادہ سی شخصیت کو دیکھ کر یقین ہی نہیں آیا کہ یہی مظفر حنفی ہیں، جن کو قدرت نے اتنی صفات سے نوازا اور کمالات سے مزیّن کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پہلی نظر میں، میں ان کی شخصیت سے زیادہ متاثر نہ ہو سکا البتہ وقتاً فوقتاً جب ان سے گفتگو کے مواقع میسّر آئے تو دل میں نہ صرف ان کی بے پناہ صلاحیتوں کا احساس جاگزیں ہوا بلکہ اس بات کا بھی معترف ہونا پڑا کہ وہ انتہائی مخلص، ہمدرد، بے باک، صاف گو، متواضع اور منکسر المزاج شخصیت کے حامل انسان ہیں۔ راقم الحروف سے پہلی ملاقات کے بعد ان کے مخلصانہ رویہ کے سبب ہمیشہ بڑے بھائی کا احساس ہوتا رہا۔ ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے چھوٹوں پر اپنی علمیت و صلاحیت کا سکّہ جمانے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ وہ دلچسپ واقعات، ادبی لطائف اور موقع و محل کے لحاظ سے منتخب اشعار سنا کر نہ صرف محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے بلکہ شرکائے محفل کو بے تکلف کر کے ان میں اپنائیت کا احساس پیدا کرا دیتے تھے۔
میں نے ہمیشہ انہیں ایک لائق شاگرد، ذمہ دار شوہر اور باپ، ہمدرد بھائی اور اچھے دوست کی شکل میں پایا اور رفقاء، اعزاء، اساتذہ نیز طلباء کے مسائل کے تئیں متفکر و سرگرم عمل دیکھا۔
یہ حقیقت ہے کہ جب انھوں نے سیفیہ کالج میں داخلہ لیا اس سے قبل ہی ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے تھے اور وہ ملک گیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ لیکن اس شہرت کا دائرہ شاعر، افسانہ نگار اور صحافی (مدیر ’’نئے چراغ‘‘ کی حد تک محدود تھا۔ ایم اے (اردو) میں گولڈ میڈل حاصل کر کے انھوں نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ اس میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ ایم اے کا نتیجہ برآمد ہوتے ہی وہ پی ایچ ڈی کی سند حاصل کرنے کے لیے تحقیقی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے اور ’شاد عارفی: شخصیت اور فن‘ کے موضوع پر ایک سال کی مدّت میں ہی تحقیقی مقالہ مکمل کر کے اس وادی پُر خار کو بھی بہ سلامت روی طے کر لیا۔ ایک تخلیقی فنکار نے، ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے جن صلاحیتوں کا اظہار کیا اس کا زبانی اور تحریری اعتراف ان کے دونوں ممتحن ڈاکٹر سید اعجاز حسین اور ڈاکٹر محمود الٰہی زخمی نے بھی کیا اور دیگر اہلِ ذوق حضرات نے بھی!
اس تحقیقی مقالہ سے متعلق اعجاز صاحب کے تعریفی کلمات میں نے اپنے کانوں سے سنے اور محمود الٰہی صاحب کا خط بنام پروفیسر عبد القوی صاحب دسنوی اپنی آنکھوں سے پڑھا جس میں انھوں نے لکھا تھا:
’’اردو تحقیق کے ریگستان میں یہ مقالہ نخلستان کی حیثیت رکھتا ہے۔‘‘
پی ایچ ڈی Viva کے بعد اعجاز صاحب کے اعزاز میں منعقدہ جلسہ میں عمائدین شہر، اردو اساتذہ و طلباء، شعرا و ادباء نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ مظفر صاحب نے ’’مجموعہ نغز‘‘ شعبہ اردو (سیفیہ کالج) کو تحفہ میں پیش کیا۔ اس دن وہ بہت مطمئن و مسرور نظر آ رہے تھے۔ یہی خوشی ان کے نگراں پروفیسر دسنوی صاحب کے چہرے سے بھی عیاں تھی۔ بھوپال یونیورسٹی سے تفویض کی جانے والی پی ایچ ڈی کی یہ پہلی سند تھی۔
یہ بات ۱۹۷۴ء کی ہے جب میں ایم اے سال اوّل (اردو) کا طالب علم تھا اور اس موقع پر میرے تمام ساتھیوں نے مظفر صاحب کو اس طرح گھیر لیا تھا جس طرح بارات میں دولہا کو گھیرا جاتا ہے۔ کوئی ان سے تحقیق کے مسائل سے متعلق سوالات کر رہا تھا کوئی ان کی ادبی فتوحات کی کہانی ان کی زبانی سننا چاہتا تھا۔ کوئی اشعار سنانے کی فرمائش کر رہا تھا۔ طالبات آٹو گراف

لینے میں مصروف تھیں۔ مظفر صاحب کے چہرے پر تکان کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ جب بھی آٹو گراف بک ان کے سامنے آتی وہ نروس ہو جاتے۔ شاید انھیں اپنے ہی کالج کے جونیئر ساتھیوں کا یہ عمل اچھّا نہیں لگ رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایک آٹوگراف بک پر صرف یہی لکھ دیا کہ ''دیکھئے! آپ مجھے نروس کر رہی ہیں۔'' کچھ آٹو گراف بکس پر اشعار نقل کئے گئے تھے۔ دو شعر جو سبھی ساتھیوں کو بہت پسند آئے۔ مجھے آج بھی یاد ہیں، آپ بھی سُن لیجیے۔

کم گوئی نے عزّت رکھ لی، مٹّھی بند ہے لاکھوں کی
ورنہ مظفرؔ لطف آ جاتا کھلتی سیپ نکلتی ریت

مشین، عہد رواں کی خدا، فریب فریب
یہ ارتقاء ہے کہ تحت الثّریٰ فریب فریب

پی ایچ ڈی کی سند حاصل ہوتے ہی مظفر صاحب کو پہلے این سی ای آر ٹی اور پھر جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی میں ملازمت مل گئی۔ دہلی منتقل ہو جانے کے بعد، بھوپال کے کسی ادارے یا سیفیہ کالج کے سالانہ مشاعرے میں شرکت کے لیے انھیں جب بھی مدعو کیا جاتا، وہ بھوپال اور سیفیہ کالج سے خصوصی لگاؤ کے باعث، عدیم الفرصتی کے باوجود ضرور تشریف لاتے۔ ان کے اعزاز میں سیفیہ کالج کے علاوہ شہر کی ادبی انجمنوں کی جانب سے نشستوں کا انعقاد عمل میں آتا۔ وہ اپنا کلام سناتے۔ بھوپال کے غزل چشیدہ ماحول کے عادی بعض حضرات ان کے تند اور تیکھے اشعار سن کر منہ بناتے تو نئے پن اور انفرادیت پسندی کے حامل حضرات بھرپور داد بھی دیتے اور مکرر ارشاد کا نعرہ بھی بلند کرتے۔

اعزاء، احباب اور مادرِ علمی سیفیہ کالج سے ان کا جو تعلق رہا، اسے انھوں نے ہمیشہ قائم رکھا۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ ۱۹۷۷ء میں شعبہ اردو میں جب ان کے اعزاز میں جلسہ منعقد کیا گیا، تو وہ اپنے ہی گھر میں مہمان بنائے جانے پر خاصے جذباتی ہو گئے تھے اور اسی عالم میں انھوں نے شعبہ اردو کے تاثراتی رجسٹر پر (جس پر ہندو پاک کے بیشتر اردو دانشوروں کے دستخط اور تاثرات درج ہیں) اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''یادش بخیر! کبھی یہ کتاب پڑھتا تھا اور خوش ہوتا تھا کہ اس کالج اور شعبے کا طالبِ علم ہوں جسے ہندوستان گیر شہرت حاصل ہے اور ہر آنے والے بڑے نقّاد اور فنکار نے اس کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ آج کہ خود درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہو چکا ہوں، اکثر فاخرانہ انداز میں مختلف مواقع اور ادبی جلسوں میں یہ بیان کرتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ نہ صرف اس ادارے سے میرا تعلق رہا ہے بلکہ اس کا فیض تا حال جاری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں تا حال سیفیہ کالج کے شعبۂ اردو کا طالب علم ہوں۔

آمد محبوب پر غالب کی حیرت یاد ہے
یہ بھی قدرت ہے خدا کی، آپ کا گھر اور ہم
(مظفر حنفی)''

مظفر صاحب کی جس بات نے مجھے زیادہ متاثر کیا تھا، وہ ہے اساتذہ سے سچّی محبت اور عقیدت مندی! اردو ادب میں استاد شاگرد کی روایت اگرچہ عام ہے لیکن آج یہ مقدّس رشتہ اپنی اہمیت کھوتا جا رہا ہے۔ اس رشتہ محبت کو ابتداء سے آخر تک مظفر صاحب نے جس طرح برقرار رکھا، فی زمانہ اس کی مثال مشکل سے مل سکے گی۔

شاعری میں شاد عارفی (مرحوم) ان کے استاد تھے تو تعلیمی سطح پر عبد القوی دسنوی صاحب! یہ مثال بھی بڑی عجیب ہے کہ شاد عارفی (مرحوم) سے بالمشافہ ملاقات کا شرف انہیں کبھی حاصل نہیں ہوا۔ ان سے رابطہ و تعلق کا وسیلہ محض ان کا فن تھا۔ مظفر صاحب نے خطوط کے ذریعے یہ رشتہ استوار کیا اور ۱۴ ماہ کی مدّت میں صرف ڈیڑھ سو غزلوں پر اصلاح لے کر اتنا کچھ حاصل کر لیا جو کہ دوسرے شاید طویل مدّت یا بالمشافہ ملاقاتوں کے بعد بھی حاصل نہیں کر پاتے ہیں۔

مظفر صاحب نے ''شاد عارفی: شخصیت اور فن'' کے عنوان سے نہ صرف پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا بلکہ ان سے متعلق کتابیں ''نثر و غزل دستہ'' ایک تھا شاعر ''شوخی تحریر''، ''شاد عارفی کی غزلیں''، ''کلیات شاد عارفی'' اور ''شاد عارفی: ایک مطالعہ'' کی اشاعت سے ان کے مقام و مرتبے کا تعین کر کے تحقیق و تنقید کے ساتھ شاگردی کا بھی حق ادا کر دیا۔ شاد عارفی کی طرح پروفیسر عبد القوی صاحب دسنوی کے تئیں بھی ان کے دل میں ہمیشہ محبت و احترام کا جذبہ موجزن دیکھا۔ نجی مسائل ہوں یا ادبی معاملات، ہر موقع پر وہ دسنوی صاحب سے مشورہ ضرور کرتے تھے۔ میری نظر میں کئی واقعات ایسے ہیں جن کے سلسلے میں مظفر صاحب نے دسنوی صاحب سے مشورہ طلب کیا اور عملی قدم اٹھایا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ محض ادبی صلاحیتوں کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ تہذیب و شائستگی کے اعتبار سے بھی میں نے دسنوی صاحب کے کسی اور شاگرد کو اتنا مہذب و مودب نہیں دیکھا جتنا کہ مظفر صاحب نظر آتے تھے۔ دسنوی صاحب کے کئی شاگرد ایسے ہیں جن کی علمی، ادبی ترقی اور روزگار کے سلسلہ میں دسنوی صاحب کی کوششوں کو دخل رہا ہے جب کہ مظفر صاحب نے جو بھی حاصل کیا محض اپنی صلاحیت اور محنت و ریاضت سے حاصل کیا تھا۔

مظفر صاحب کو اپنے اساتذہ سے جو دلی محبت تھی اس کا اظہار انھوں نے اپنے مضمون بعنوان '' قوی صاحب'' (مطبوعہ ''نقد ریزے'') میں اس طرح کیا ہے:

''یہ سب کچھ ایک مردہ اور ایک زندہ استاد کا فیض ہے۔ خدا شاد عارفی صاحب کو جنّت الفردوس میں جگہ دے کہ مرحوم سے مزاجی مناسبت اور شدید جذباتی لگاؤ نے دیوانہ وار محنت کرنے کی سکت مجھ میں پیدا کی... دسنوی صاحب قیامت تک سلامت رہیں کہ موصوف نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی۔ حالات کا سر اٹھا کر مقابلہ کرنا سکھایا۔ شب و روز میرے ساتھ مغز پاشی کی۔ میرے ساتھ ہونے والی نا انصافیوں کے سامنے خود سینہ سپر ہوئے، میری فنکارانہ انانیت کو نفسیاتی طریقوں سے متوازن کیا اور مجھ میں طلب علم کی لو جگائی۔ زندگی میں مجھے جن دو شخصیتوں نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ ہیں شاد عارفی اور عبد القوی دسنوی۔''

مظفر صاحب کا یہ اعتراف ان کی شرافت نفس اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے۔ جس طرح اردو فنکار عام طور پر نا مساعد حالات سے دوچار رہے ہیں، مظفر صاحب کو بھی ویسے ہی حالات سے گزرنا پڑا ہے۔ عمر کے ابتدائی ایّام میں وہ ان تمام آسائشوں سے محروم رہے جن سے شخصیت کی تعمیر میں مدد ملتی ہے لیکن ان کی غیر معمولی قوّت ارادی، محنت، ریاضت اور ادبی صلاحیت کے باعث کوئی بھی آزمائش ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہوئی بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آزمائشوں نے تازیانے کا کام انجام دے کر انہیں بے حد فعال، حسّاس اور بے باک بنا دیا اور حقیقت بیانی اور صاف گوئی ان کے مزاج کا حصّہ بن گئی۔ حالات کی بھٹی میں تپ کر کندن بننے والی شخصیت نے اپنے تجربات و مشاہدات کو جب شعر کے پیکر میں ڈھالا تو کلام ایک مخصوص لب و لہجہ اور رنگ و آہنگ کا حامل بن گیا۔ ابتدا میں انھوں نے اپنے استاد شاد عارفی کے رنگ میں شعر کہے اور رموزِ فن نیز قدرت کلام حاصل کرنے کے بعد اس رنگ سے وہ رنگ پیدا کر لیا جس پر نہ صرف ان کا ٹھپّہ لگا ہوا ہے بلکہ جو اب ان کی پہچان بھی بن چکا ہے۔

ٹھپّہ لگا ہوا ہے مظفرؔ کے نام کا
اس کا کوئی بھی شعر کہیں سے اٹھا کر دیکھ

تجریدیت، عصری حسّیت، ندرت اور انفرادیت نے مظفر صاحب کے شعری اسلوب میں نئی معنویت پیدا کر دی ہے۔ اس ضمن میں ان کے حسب ذیل اشعار مبنی بر حقیقت ہیں، شاعرانہ تعلّی نہیں ہیں:

لکیروں کے فقیروں سے مظفر کچھ نہیں ہو گا
نئی نسلوں کی خاطر ہم نئی راہیں بناتے ہیں
*
مِرے تئیں تو مظفرؔ غزل، غزل ہی نہیں
اگر خیال نہ ہو ندرت ادا میں کوئی
*
جب وقت نے چھانی ہیں مظفرؔ کی بیاضیں
ہر شعر میں، ندرت کا دفینہ نکل آیا
*
انفرادی رنگ رکھتا ہے مظفر شعر میں
اس کے مصرعے پر کوئی مصرعہ تو پہنچائے ذرا

انفرادیت پسندی کے ساتھ مزاج کا کھرا پن اور بانکپن مظفر صاحب کے کلام میں نمایاں ہے۔ انہیں اپنے کلام کے تیکھے لہجے کا احساس بھی تھا اور اعتراف بھی:

کچھ تیکھا پن اور مظفرؔ
لہجے کو لاثانی کر لو
*
مظفرؔ سب ہی گلدستے بنا لیتے ہیں پھولوں سے
مگر ہم نے تو کانٹوں سے یہ گلدستہ بنایا ہے

*

سوچ نئی ہے لہجہ تیکھا، لفظ کھرے آواز جدا
دانستہ رکھتا ہوں، اپنے شعروں کا انداز جدا

جدّت پسندی اور ندرت ادا کے سبب روایت پرستی یا لہجہ کی یکسانیت کا الزام مظفر صاحب پر عائد نہیں کیا جا سکتا۔ تجریدیت کے باوجود ان کی تخلیقات ترسیل کے المیہ کا شکار نہیں ہوتیں بلکہ ہلکا سا ابہام شعر میں تہہ داری پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔
مظفر صاحب کے کلام کا اہم وصف طنز بھی ہے جو کہ ان کی تخلیقات کی سرشت میں داخل ہے اور جسے انھوں نے کارگر ہتھیار کے بطور استعمال کیا ہے۔ ہر سچّے فنکار کی طرح مظفر صاحب کے کلام سے بھی ان کے مزاج و ماحول کی عکّاسی ہوتی ہے اور شعری رویّے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مظفر صاحب نے زندگی اور سماج کے زخموں کو نئے لہجے کے ساتھ آئینۂ غزل میں منعکس کرنے کی سعی کی اور اس اعتبار سے ان کا یہ دعویٰ غلط نہیں کہ:

ہر شعر ہے اس عہد کی منہ بولتی تصویر
اس باب میں دیوان مِرا ساغر جم ہے

ہم عصر اردو ادب میں مظفر صاحب کا کلام کھنکتی ہوئی آواز اور زندگی کے حقیقی پہلوؤں کی عکّاسی کے سبب اپنی خاص پہچان رکھتا ہے۔ ان کا شمار اردو کے صاحبِ طرز، نمائندہ جدید شعرا میں ہوتا ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جن کے باعث مشہور شاعر اختر سعید خاں نے اردو رائٹرس گلڈ بھوپال کی جانب سے مظفر حنفی صاحب کے اعزاز میں منعقدہ جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے کہا تھا کہ:
''اب اردو غزل کو مظفر حنفی کی روش اختیار کرنا ہو گی''
مظفر حنفی صاحب ایک ہمہ جہت فنکار تھے۔ ان کے ادبی کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ طنزیہ غزلوں، پابند و آزاد نظموں، ادب اطفال، ناول، سفرنامے اور افسانوں کے ساتھ ساتھ انھوں نے مختلف موضوعات پر تحقیقی تنقیدی مقالات، تراجم اور تبصرے بھی سپرد قلم کیے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کئی ناقدین و ادبا ء نے کیا ہے۔ ان کے ادبی کارنامے ہمارے لیے فخر و انبساط کا باعث ہی نہیں مشعلِ راہ بھی ہیں۔ ان کا سانحۂ ارتحال اردو ادب کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔
****
(مطبوعہ سہ ماہی کاروانِ ادب بھوپال دسمبر 2020)

خاکے
اُستاد فضل حسین شرر کا سفید موتی --- علی اکبر ناطق

وہ ہمارے گھر کے بالکل قریب ہی رہتا تھا لیکن یہ بات میں نہیں جانتا تھا۔ مَیں نے تو اُسے صرف سکول میں دیکھا۔ اُس دن بالکل یہی موسم تھا، اکتوبر کے پہلے دس دن گزر چکے تھے اور دھوپ میں گرمی نہیں تھی۔ وہ کھلے گراونڈ میں کُرسی پر بیٹھا، اتنا پُر سکون تھا، جتنا کوئی خزاں رسیدہ درخت ہو سکتا ہے۔ پُشت کو کرسی پر ٹکا کر، دونوں پاؤں زمین پر سیدھے رکھے، اُس کی نظریں آسمان کی بلندی پر دائرے میں اُڑتی اُن چار عدد چیلوں پر تھیں، جو ہر چکر کے بعد مزید بلند ہو جاتیں اور اب نُقطوں کے برابر رہ گئی تھیں۔ مَیں اُس کے پیچھے چُپکے کھڑا دیکھتا رہا۔ مجھے یقین تھا، مَیں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ جب وہ سفید موتی جیب سے نکالے گا تو میں ضرور دیکھ لوں گا لیکن کافی دیر کھڑے رہنے کے باوجود ایسا نہ ہوا۔ وہ ہر طرف سے ساکت، دونوں بازو کُرسی کی دستیوں پر رکھے بیٹھا رہا۔ اُس کی نظریں چیلوں سے ہٹ کر، سکول کی چار دیواری سے باہر، آموں کے باغ کی طرف مُڑ گئیں، جہاں رنگ رنگ کے پرندے سبز پتوں میں جھول رہے تھے اور تین بچے اُچھل اُچھل کر آم کی موٹی شاخوں سے اُلٹے سیدھے لٹکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مَیں دل ہی دل میں اُس پر تلملانے لگا۔ آخر وہ کیوں اپنا ہاتھ جیب کی طرف لے جا کر انڈے کے برابر کا سفید موتی نہیں نکالتا۔ اِسی بے دھیانی میں آگے ہوتا گیا اور نہ جانے کب اُس

نے میرے قدموں کی چاپ سُن لی۔ اُسی وقت اُس نے مُڑ کر دیکھا۔ میں دو قدم پر تھا، اُس کے دیکھتے ہی بھاگ اُٹھا اور ہانپتا ہوا کلاس میں آ گیا، جو ایک دوسرے گراونڈ میں گھاس کے فرش پر بیٹھی تھی۔ کلاس میں داخل ہو کر مَیں لڑکوں کے درمیان میں بیٹھ گیا۔

سکول کافی بڑا تھا، بہت بڑا، لیکن چار دیواری چھوٹی تھی، اتنی چھوٹی کہ تین فٹ کا بچہ مضافات کو دیکھ سکتا تھا۔ سامنے کی مسجد کے اُونچے منار اور اُن کے سفید گُنبدوں پر بیٹھے یا اُڑتے ہوئے کبوتر ایک طرح سے سکول کا حصہ تھے۔ چار دیواری کے ارد گرد ہری فصلوں کے پھیلے ہوئے کھیت اور بڑے باغوں کے سیاہ جھرمٹوں کا سایا سکول میں چلا آتا اور گراؤنڈوں کی سبز گھاس سے مل کر اُس میں طلسم سا پیدا ہو جاتا، پھر وہ طلسم دھوپ کو اپنے حصار میں لے لیتا۔

مُجھے سکول میں دوسرا سال تھا۔ اِس عرصے میں کبھی نہیں دیکھا، وہ اساتذہ کے پاس بیٹھا ہو یا اُس نے سٹاف روم کا رُخ کیا ہو۔ بس کسی گراؤنڈ کے دُور کونے میں کرسی پر خموش بیٹھا، آسانی سے نیلے، بھورے یا کالے بادلوں والے آسمان کو دیکھتا رہتا یا کبھی کبھی کتاب کھول کے پڑھنے لگ جاتا، جو وہ گھر سے لانا نہ بھولتا۔ ایسا بھی ہوا کہ سکول کے مغربی کونے میں، جہاں ایک چھوٹا سا پلاٹ تھا، چہل قدمی شروع کر دیتا۔ اُس میں چوکیداروں نے سبزیاں کاشت کر رکھی تھیں۔ وہ اُن کا رکوع کی حالت میں ہو کر اور اپنی لاٹھی کو سبزیوں کی جڑوں میں مار مار کر باریکی سے جائزہ لیتا پھرتا، مگر چوکیداروں سے بول چال کو راہ نہ دیتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا، یہ کون ہے؟ کلاس لیتے یا بچوں کو پڑھاتے مَیں نے اُسے نہیں دیکھا لیکن میرے لیے حیرانی کی بات یہ تھی کہ سکول کے اُستاد اور لڑکے اُس کو اُستاد کے لقب سے ہی منسوب کرتے۔ پتا نہیں کیوں؟ اُن دنوں کلاسیں بھی گراؤنڈ میں لگتی تھیں، کھُلے آسمان تلے۔ ایسا نہیں کہ کمرے نہیں تھے۔ بس استاد اور بچے گراؤنڈ کو ہی ترجیح دیتے۔ اِس کے باوجود کہ اُس کو مَیں نے کبھی پڑھاتے نہیں دیکھا، پھر بھی سکول سے ناغہ نہ کرتا۔ سو کنال رقبے کے سکول میں، وہ کبھی ایک کونے میں ہوتا، کبھی دوسرے میں۔ مَیں جب تک ایک نظر اُسے دیکھ نہ لیتا، طبیعت بے قرار رہتی۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ اُس کے پاس ایک انڈے کے برابر سفید رنگ کا موتی ہے اور اُس موتی میں ایک جِن بند ہے۔ وہ جِن اُسے لوگوں کے راز اور غیب کی باتیں بتاتا ہے اور گیت بھی سناتا ہے۔ اُس جِن نے اِسے بہت سارا خزانہ بھی دیا تھا، جو اِس نے اپنے گھر میں گڑھا کھود کر چھپا رکھا ہے۔ یہ موتی وہ ایک ڈبیا میں چھپا کے دائیں جیب میں رکھتا ہے اور کسی کو نزدیک نہیں آنے دیتا، نہ خود کسی کے قریب جاتا ہے۔ کئی لڑکوں نے اُس کے بیٹوں سے موتی کے بارے میں پوچھا لیکن وہ بھی اِتنا ہی بے خبر تھے جتنا عام لڑکے۔ اُن کا کہنا تھا، اُن کی والدہ نے ابا جی کے برتن، کمرہ اور بستر الگ کر رکھا ہے اس لیے اُن کو اس بارے میں زیادہ معلومات نہیں۔ اِتنا ضرور ہے کہ اُس کے پاس بوسیدہ کتابوں کا ایک ڈھیر ہے، جس میں عجیب و غریب نہ سمجھ آنے والی باتیں درج ہیں۔ شاید سفید موتی اُن کتابوں میں چھُپا کر رکھ دیا ہو اور وہاں جا کر ہم نے نہیں دیکھا۔

میری شدید خواہش تھی، مَیں وہ موتی دیکھوں لیکن جِن سے ڈرتا تھا۔ دو تین بار یہ ضرور ہوا کہ وہ کرسی چھوڑ کر جیسے ہی چہل قدمی کے لیے اُٹھا، مَیں بھاگ کر کُرسی کے پاس گیا مگر مجھے وہاں گھاس کے تنکوں کے سوا کوئی چیز نظر نہ آئی۔ کُرسی کو ہلا کر اُس کے پایوں کے نیچے دیکھنے کی جرات اِس لیے نہ ہوئی، کہیں نیچے جِن نہ بیٹھا ہو۔ اُس کے پاس جِن کے موجود ہونے کی ایک اور دلیل بھی تھی کہ اُس سے سب سکول کے اُستاد ڈرتے تھے اور اُس کا نام آتے ہی با ادب ہو جاتے حالانکہ اِتنا کمزور تھا کہ دس سال کا بچہ بھی اُسے چت کر لے۔ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچا، چلتے ہوئے اکثر لڑکھڑا جاتا۔ سٹاف روم میں چائے بنتی تو چوکیدار اُس کے لیے بھی لے آتا، جسے وہ بغیر شکریے کے قبول کر لیتا۔

جس دن مَیں نے اُس کے پیچھے جا کر دیکھنے کی کوشش کی، یہ اُس سے دوسرے دن کی بات ہے۔ مَیں اپنی کلاس میں بیٹھا ریاضی کی ایک مشق کر رہا تھا کہ لنگڑا چوکیدار، جو اُسے چائے دے کر آیا تھا، نے میرا نام لیا اور کہا، مُنشی فضل حسین بلاتے ہیں۔ اُس وقت میری عمر محض آٹھ سال تھی۔ مَیں مردہ ٹانگوں کے ساتھ اُٹھ کر چوکیدار کے پیچھے چلنے لگا۔ بھاگنے کی طاقت اول تو تھی نہیں، دوم اُس کا جِن مجھے ایک قدم نہ بھاگنے دیتا۔ چند لمحوں میں ہم وہاں جا پہنچے اور آج یہ پہلا دن تھا، جب مَیں اُس کے اتنا قریب کھڑا تھا کہ اُس سفید انڈے کے برابر موتی کی خوشبو لے سکتا تھا لیکن اب اُس کا خیال ڈر کی وجہ سے محو ہو گیا۔ چوکیدار جا چکا تھا۔ پچاس قدم کے دائرے میں اب نہ تو کوئی کلاس تھی، نہ لڑکا تھا، نہ اُستاد۔ فقط وہ تھا اور مَیں مجرموں کی طرح سامنے کھڑا تھا۔ مجھے اس بات کی حیرانی بالکل نہیں تھی کہ اُس نے میرا نام کیسے جانا، ظاہر ہے جِن کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی۔

اُس کے چہرے کی بجائے وہاں باریک ہڈیاں تھیں لیکن اُن کے اُوپر جلد اتنی نرم اور سفید تھی کہ ہڈیاں بُری معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ ہاتھوں کی ناڑیں نیلی اور ماس کے نیچے کی تہیں ہڈیوں کو مزید واضح کر رہیں تھیں۔ آنکھیں چمکدار تھیں مگر زیادہ ہی اندر کو دھنس چُکی تھیں، جن پر سیاہ ہلکے پڑے تھے۔ بال سر پر موجود تو تھے مگر اِتنے کم کہ کنپٹیوں کی درزیں صاف دیکھ سکتا تھا۔ سر پر دو پلّی ٹوپی جما کر آتا لیکن وہ چلتے وقت ہی سر پر رکھتا تھا، جیسے ہی کُرسی پر بیٹھتا، ٹوپی اُتار دیتا۔ مجھے اُس سے آنکھیں ملانے میں مشکل پیش آ رہی تھی اور مَیں مسلسل سکول کی دیوار کے ساتھ ساتھ کچی سڑک پر جاتے اُس

چرواہے کو دیکھ رہا تھا، جو بے شمار بھیڑوں کو ہانکتا، نہر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بھیڑوں کے گزرنے سے غبار اور بُو کی ہلکی لہر ہمارے ناکوں کو چھونے لگی۔ یہ بھیڑیں اور چرواہا اتنی خاموشی سے گزر رہے تھے جیسے ان کے قدموں کے نیچے روئی بندھی ہو۔ اُسی لمحے مَیں نے سوچا، یہ چرواہا کیسا آزاد ہے کہ اُسے منشی فضل نے اپنے سامنے حاضر نہیں کیا۔

’بیٹے بیٹھ جاؤ‘

یہ آواز منشی فضل حسین کی بجائے کہیں غیب سے آئی تھی، جسے سُنتے ہی مَیں گھاس پر بیٹھ گیا اور پہلی دفعہ میری نظر نے اُس چھڑی کو غور سے دیکھا، جو کُرسی کے دائیں پائے سے سہارا دے کر کھڑی کی تھی۔ چھڑی کا قبضہ اِتنا ملائم تھا کہ میرا جی چاہا، اُسے پکڑ کر دیکھوں اور اُس پر ہاتھ پھیروں مگر اِس پر عمل کرنا نا ممکن تھا۔ مَیں بیٹھ گیا اور اُس کی ٹانگوں کے درمیان، جو پتلون کے اندر صندل کی دو لاٹھیاں محسوس ہو رہی تھیں، سے جگہ بنا کر کُرسی کے چار پایوں کے درمیان دیکھنے لگا، جہاں خلا کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

’کس درجے میں بیٹھتے ہو؟‘

’اُستاد جی، تیسرے درجے میں ہوں، ماسٹر خالق صاحب پڑھاتے ہیں۔

’کیا کچھ پڑھا؟‘

اس کا جواب نہیں تھا۔ مَیں ایک تنکے سے محض زمین کُریدنے لگا اور کچھ نہ بولا۔

’تم جانتے ہو مَیں کون ہوں؟‘

مَیں اِس بات پر بھی چُپ رہا اور انگلیوں سے گھاس کی جڑیں اُکھاڑنے لگا۔ مجھے یقین تھا، کل والے واقعے کی وجہ سے بلایا ہے اور کچھ ہی لمحوں بعد اُس بات کی پُرسش ہونے والی ہے چنانچہ اُسی کا جواب سوچنے لگا۔

’بیٹا آپ میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ اچھا، یہ بتاؤ، تمھیں کوئی شعر آتا ہے؟‘

’جی اُستاد جی، آتا ہے۔‘ اُس کے لہجے کی ملائمت نے میرے اندر حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔

’چلو کوئی شعر سناؤ۔‘

’ہوئی شیر سے جب پسر کی لڑائی
سکندر کے بیٹے نے گولی چلائی
سکندر کا بیٹا کھڑا رہ گیا
لہو کا پیالہ بھرا رہ گیا‘

’واہ، کمال کر دیا تُو نے، یہ کس کے شعر ہیں؟ کہاں سے یاد کیے؟‘

اس بات کا بھی میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور نہ یہ پتا تھا کب اور کیسے یاد ہو گئے اس لیے پھر چُپ ہو رہا۔

’اچھا کوئی اور سناؤ۔‘

’وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا‘

’شاباش، بہت ہی خوب۔ اچھا، اس شعر کا تو آپ کو پتا ہو گا، کس کا ہے؟‘

’جی اُستاد جی‘ اب میں جلدی سے بولا ’یہ مولوی عنایت کا شعر ہے۔‘ اِس میں کوئی شک نہیں تھا کہ مَیں نے سینکڑوں بار اُس کی زبان سے سُنا تھا، جب وہ جامع مسجد کے سپیکر پر چندہ مانگتے ہوئے ایک لمبی نعت پڑھتا تھا۔ اُس میں مجھے صرف یہ شعر ہی یاد رہ گیا تھا اور یہ کتنا اچھا ہوا کہ مَیں نے منشی کو صحیح صحیح جواب دے دیا۔

’اچھا، میرے نزدیک آؤ۔‘

مَیں تھوڑا سا آگے ہو گیا۔ مَیں جانتا تھا، لڑکے دُور کھڑے تماشا دیکھ رہے ہیں اور میرے انجام کے بارے میں فیصلہ کن بات پر نہیں پہنچ پا رہے۔ سب کو یقین تھا، منشی فضل حسین کے جِن کے شکنجے میں پھنس چکا ہوں۔

’اور نزدیک ہو جاؤ۔‘

مَیں اور نزدیک ہو گیا۔ اُس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کاندھے پر تھپکی دی۔ مَیں نے محسوس کیا، اُس کے ہاتھ کا وزن کاغذ سے زیادہ نہیں تھا۔ اِس شفقت کے سبب میرے اندر پنپتا ہوا تجسس بے اختیار زبان پر آ گیا۔ ’اُستاد جی، لڑکے کہتے ہیں، آپ کے پاس انڈے برابر سفید موتی ہے۔‘

’ہاں بیٹا وہ ٹھیک کہتے ہیں‘ ماسٹر فضل حسین رواں آواز میں بولا۔ ’میرے پاس موتی ہے لیکن یہاں کوئی اُس کے دیکھنے کا اہل نہیں اس لیے اُس کو چھپا کے رکھتا ہوں۔ کل تم میرے پیچھے وہ موتی دیکھنے کے لیے کھڑے تھے؟‘

مَیں سر ہلا کر رہ گیا اور وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔

’اگر مَیں نے دکھایا اور تم لے کر بھاگ گئے؟‘

’اللہ کی قسم، نہیں لے کر بھاگتا‘ مَیں نے بچکانہ اصرار کے ساتھ کہا
وہ ہنس دیا اور ٹوپی اُٹھا کر سر پر لے لی، جو اُس کی جھولی میں پڑی تھی، پاؤں میں جوتے اڑسنے لگا۔ یہ تیاری گویا اُس کے اُٹھنے اور کسی طرف جانے کی تھی۔
’اچھا، ہم ایک کام کرتے ہیں، میرے ساتھ آؤ۔‘
لاٹھی، اُسے آپ عصا بھی کہہ سکتے ہیں، اُس کے ہاتھ میں تھی، جسے اُس وقت پکڑنے کی شدید خواہش مجھ میں پیدا ہوئی۔ پاؤں میں پتلی ریکسین کے جوتے تھے۔ اُن کے اندر پاؤں کے علاوہ مزید بھی جگہ تھی۔ مَیں اُس کے پیچھے چلنے لگا۔ مجھے کیا معلوم، وہ کدھر جا رہا تھا؟ لیکن یہ سفر اُسی سکول کے گراؤنڈ میں ہونے کے باوجود، جہاں مَیں روز دوڑتا تھا، آج ایک طلسماتی سا ہو گیا۔ میری نظریں اُس کی لاٹھی پر تھیں، جو بغیر آواز پیدا کیے، سیدھی آگے چلی جاتی تھی اور مَیں عادتاً اُس کے نشانوں پر پاؤں رکھتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ یہ میرے لیے ایک کھیل تھا۔ ہم نے ایک گراؤنڈ کو کراس کیا پھر دوسرے کو، پھر تیسرے کو۔ اُس کے بعد جنوبی سمت میں ایک دیوار کے ساتھ کھڑے آسمان قامت پیپل کے نیچے آ گئے، جس کی جڑیں دیوار میں اِس طرح گھل مل کے دُور تک نکل گئی تھیں کہ دیوار کی بوسیدہ اینٹیں مُڑ تُڑ کر اُس کے تنے کا حصہ بن چکی تھیں۔ بہت سی جڑیں زمین میں موٹی اور گول چوکیوں کی شکل میں اِدھر اُدھر اُبھری ہوئی تھیں۔ اِن کے نیچے بلیوں اور خرگوشوں نے اپنے ڈربے بنا رکھے تھے۔ شاخوں اور پتوں نے ایک دنیا کو گھیرا ہوا تھا۔ گراؤنڈ کا چوتھائی حصہ اِس کی لپیٹ میں تھا اور پرندے اِتنے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ یہی وہ پیپل تھا، جس کے بارے کسی کو شک نہیں تھا کہ اس پر بھوت اور جِن رہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص دن کے بارہ بجے یا رات کے بارہ بجے اِس کے تنے کے گرد سات چکر لگا کر جڑوں میں پیشاب کر دے تو اُسی وقت چڑیلیں اُس کی گردن توڑ دیتی ہیں۔ چنانچہ ابھی تک کسی کو ایسا کرنے کی جرات نہیں ہوئی تھی۔
منشی فضل حسین نے مجھے ایک بھاری اور اُبھری ہوئی جڑ پر بیٹھنے کو کہا، جو ایک بڑی چوکی سی بن گئی تھی۔ میں اُس کی حکم عدولی کیے بغیر آرام سے بیٹھ گیا۔ لڑکے دُور جھرمٹ بنا کر دیکھ رہے تھے۔ مَیں کانپنے لگا کہ مجھے جنوں کو پکڑوانے کے لیے لے آیا۔ مَیں ایک ہی دم پسینے سے شرابور ہو گیا۔
’اِس جگہ کو پہچان لو۔ روزانہ مَیں تمھیں یہیں پر تین گھنٹے تک کچھ منتر پڑھاؤں گا۔ جب تک وہ منتر تم یاد نہیں کر لیتے، مَیں وہ سفید موتی تم کو نہیں دکھا سکتا۔ کیا تم کو منظور ہے؟‘ منشی فضل حسین نے لاٹھی سے اُس جڑ پر ٹھوکر لگاتے ہوئے کہا، سچ تو یہ تھا کہ ابھی مَیں موتی کو بھول کر اپنی جان چھڑانے کے چکروں میں تھا۔ کجا منتر یاد کرتا پھروں لیکن جِنوں کا خوف مجھ پر اتنا سوار تھا کہ انکار کرنا میرے بس سے باہر تھا۔ چنانچہ مَیں نے اوپر نیچے سر ہلا دیا۔
’بس کل سے سکول کی کتابیں اور منتر سب کچھ یہیں دو گھنٹے تک تم کو پڑھاؤں گا۔ تم اپنی کلاس میں جانے کی بجائے یہیں آ جایا کرنا۔ اگر نہیں آؤ گے تو تمھارے پیچھے جِن کو لگا دوں گا۔‘
اُس کے بعد حکم ہوا کہ اب گھر چلا جاؤں۔ میں اسی انتظار میں تھا، حکم ملتے ہی اُلٹے پاؤں بھاگا اور گھر آ گیا، جو سکول سے سو قدم کے فاصلے پر تھا۔ گھر آ کر میں نے سارا واقعہ اپنی والدہ کو سنایا لیکن وہ بجائے پریشان ہونے کے ہنستی رہی۔ اُس نے کہا، ’بیٹا یہ استاد فضل حسین ہمارا پڑوسی اور تمھارے ابا کا گہرا دوست ہے، بڑا اچھا اُستاد ہے، تمھیں پڑھائے گا۔ تیرے ابا نے اس کی منت کی ہے۔ ماسٹر صاحب سے جی لگا کر سب کچھ سیکھنا۔‘
’اب یہ دوسروں کو کیوں نہیں پڑھاتا؟ سارا دن خالی بیٹھا رہتا ہے۔‘
’بیٹے جِن نے اس پر سایا کیا ہوا ہے، جس کی وجہ سے وہ زیادہ دیر پڑھا نہیں سکتا۔‘
میری سمجھ میں والدہ کی باتیں نہیں آئیں لیکن چُپ ہو گیا۔ دوسرے دن صبح آٹھ بجے بستہ لے کر سکول پہنچا اور ارادہ کیا کہ اپنی کلاس کی طرف جاؤں، اُسی لمحے اُس نے مجھے دیکھ لیا۔ پیپل سکول کے مرکزی گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی جنوبی دیوار کے ساتھ تھا، جو سامنے ساٹھ ستر قدم پر موجود تھی۔ اُس کے اور گیٹ کے درمیان کوئی شے حائل نہیں تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے لاٹھی ہلا دی چنانچہ میں اُس کی طرف چلا گیا۔
’لے بیٹا، آج منتر کا پہلا سبق شروع کرتے ہیں لیکن پہلے ایک ایک سوال آپ کی درسی کتابوں کا ہو جائے‘ اُس نے میرے ہاتھ سے بستہ لے کر اُسے ٹٹولتے ہوئے کہا۔ مَیں نیچے اُسی جڑ کی چوکی پر بیٹھ گیا، جس پر کل بیٹھنے کو کہا گیا تھا۔ اِس کے بعد ڈیڑھ گھنٹے تک اُس نے مجھے اس طرح درسی کتب پڑھائیں گویا باتیں ہو رہی ہیں۔ مَیں نہیں سمجھتا کہ اُس نے کچھ پڑھایا تھا، ہاں جو باتیں کیں وہ سب یاد ہو گئیں۔ پھر اچانک کہا، اب آپ کو منتر سکھائیں گے اور دو چھوٹے سے قاعدے نکال لیے، جن کی زبان کچھ عجیب سی تھی لیکن اُس کو پڑھنے میں مزا آتا تھا۔ دو منتر وہیں بیٹھے بیٹھے یاد بھی کرا دیے۔ اُن کا نام اُس نے امیر خسرو کی پہیلیاں بتایا اور سختی سے منع کیا کہ ’کسی کو اس منتر کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ بتاؤں ورنہ سارا اثر زائل ہو جائے گا، ایک اور بات کا دھیان رہے، جس دن یہ موتی مَیں نے تیرے حوالے کیا، اُس کے بعد زندہ نہیں رہوں گا۔ اس لیے پہلے تمام منتر سیکھ لو اُس کے بعد موتی لینا، کہیں کام ادھورا رہ جائے اور جِن تم پر چڑھ دوڑے اس لیے جلدی نہیں کرنا۔ شیطان

تمھیں بار بار بہکائے گا مگر تم اُس کی باتوں میں نہ آنا۔'
یہ باتیں جاری تھیں اتنے میں ایک طوطے نے اُوپر سے بیٹ پھینکی کہ اُستاد جی کی پوری ناک اور دامن کا کُرتہ سُرخ رنگ کی بیٹ سے بھر گیا، جس کے اندر پیپل کی گوہلوں کے چھوٹے چھوٹے بیج صاف دلفریبی دکھا رہے تھے۔
'او تیرا ستیا ناس، نالائق جگہ بھی نہیں دیکھتے' ماسٹر فضل حسین نے ہش ہش کرتے ہوئے اُوپر کی طرف دیکھا۔
'اُستاد جی آپ فکر نہ کریں، میں کل کو غلیل لے کر آؤں گا، ایک ایک کو تاک تاک کر ماروں گا' میں نے ماسٹر کی خوشامد کی اور ایک کچی مٹی کا ٹکڑا اُٹھا کر اُوپر پھینکا۔
'نا بیٹا، اِن کو مارتے نہیں، یہ پرندے خدا کی اولاد ہیں، انہیں مارو گے تو خدا ناراض ہو گا اور وہ بھی تمھیں مارے گا۔'
'استاد جی خدا تو نہیں مارتا، مَیں نے پہلے بھی کئی بار اِنہیں غلیل سے مارا ہے۔'
'اچھا یہ بتاؤ، تمھیں کبھی بخار ہوا ہے؟'
'کئی بار، ایک دفعہ تو بے ہوش ہو گیا تھا۔'
'بس یہی خدا کی مار ہے، وہ تھپڑوں سے تھوڑی مارتا ہے؟ بلکہ کل سے تم ایک اور کام بھی کرو۔ گھر سے روزانہ ایک روٹی اِن کے لیے لاؤ اور اُس کے ٹکڑے کر کے ان کے آگے پھینکا کرو۔ ہم اِن کے گھر آ کر بیٹھے ہیں، اُس کا معاوضہ بھی تو اِن کو دینا ہے۔'
استاد جی کی بات پر مَیں کھلکھلا کر ہنس دیا۔ 'یہ کوئی ان کا گھر تھوڑی ہے؟'
'تو اور کس کا گھر ہے؟ کبھی تم نے انسانوں کو درختوں پر رہتے دیکھا اور پرندوں نے کبھی مکان بنائے؟'
'نہیں تو۔'
'اگر نہیں تو پھر میری بات پر ہنسنے کی کیا تُک ہے؟ بھئی خدا نے درخت اِن پرندوں کے لیے ہی بنائے ہیں۔ یہ تو اِن کی مہربانی ہے کہ ہمیں سائے میں بیٹھنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اگر ہمارے سروں پر ٹھونگے مار مار کر نکال باہر کریں تو ہم ان کا کیا بگاڑ لیں گے؟ انسان تو اتنا کم ظرف ہے، اِن درختوں کو سرے سے ہی کاٹ کر اپنا سایا اور ان کا گھر تباہ کر دیتا ہے۔'
بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ واقعی استاد جی سچ کہتے تھے۔ ان کا ٹھونگا بہت بُرا ہوتا ہے۔ مجھے فوراً وہ واقعہ یاد آ گیا جب میرے سر کی ٹِنڈ کو ابھی دو دن ہی ہوئے تھے اور میں باہر صحن میں کھڑا جلیبی کا ٹکڑا کھا رہا تھا تو ایک کوئے نے ٹنڈ پر وہ زور کا ٹھونگا مارا کہ خون نکل آیا اور جلیبی ہاتھ سے گر گئی، جسے دوسرا کوا جلدی سے جھپٹ کر لے گیا تھا۔
مَیں نے کہا، 'اُستاد جی یہ کوئے بہت بُرے ہوتے ہیں، بہت سخت ٹھونگا مارتے ہیں۔'
میری بات پر ماسٹر فضل حسین کی ہنسی نکل گئی۔ وہ بولا، 'اسی لیے تو میں کہتا ہوں، ہر ایک پرندے کا نام یاد کر کے اُن کو دوست بنا لو۔'
'یہ میرے دوست کیسے بنیں گے؟ یہ تو ڈر کے اُڑ جاتے ہیں۔'
'جب تم اِن کو غلیل سے مارو گے تو کیا آ کر تمھارے گلے ملیں؟'
اتنے میں تفریح کی گھنٹی بجی اور میں نے للچائی نظروں سے ماسٹر کی طرف دیکھا مگر اُس نے ایک اور کام کیا، اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہا، میرے ساتھ آؤ۔ مجھے کیاریوں اور پھولوں کے پاس لے آیا اور ایک شاخ کو جھکا کر خوبصورت پھول کو میرے سامنے کیا، 'یہ کیا ہے؟'
'یہ پھول ہے' میں نے فوراً جواب دیا۔
'اور اِس کی پتیوں کے اندر کیا ہے؟'
اب پھر میرا علمی سرمایہ ختم ہو گیا۔ پتیوں کے اندر کیا ہو سکتا تھا، کچھ بھی نہیں تھا، میں کیا جواب دیتا؟
میں نے مسکرا کر کہا 'کچھ بھی تو نہیں ہے۔'
'کیوں کچھ نہیں ہے؟ اس کی پتیوں کے اندر جو نیلے پیلے اور گلابی ریشے نظر آتے ہیں، یہ اصل میں خدا کی روحیں ہیں اور جو ہلکی ہلکی خوشبو سونگھ رہے ہو، جسے تم دیکھ نہیں سکتے، یہ خدا ہے۔ یہی وجہ ہے، انسان جتنے زیادہ پھول اور درخت لگاتا ہے، اللہ اُس سے اتنا ہی خوش ہوتا ہے اور اُسے بڑے بڑے سفید موتی دیتا ہے۔'
اس کے بعد وہ مجھے دیر تک ایک ایک پھول کی کہانی بتانے لگا، جن کے اندر جنوں اور پریوں کے مسکن تھے۔ اب مجھے یاد آیا کہ یہ جو بار بار پھولوں اور درختوں کی طرف دیکھتا رہتا تھا، در اصل یہی راز تھا۔ مجھے دوسرے لڑکوں پر ہنسی آئی، جن کو اس بات کا پتا نہیں چل سکا تھا کہ اصل میں ماسٹر فضل حسین کے ہاتھ یہ موتی اور جِن کیسے لگا۔
تمام لڑکے کھیل چھوڑ کر ہمارے نزدیک آ گئے لیکن اتنا نزدیک بھی نہیں کہ ماسٹر کی باتیں سن سکیں بلکہ ایسے فاصلے پر، جہاں سے خطرہ بھانپتے ہی بھاگ سکیں۔

یہ وقت ایسے گزرا کہ مجھے پتا ہی نہ چلا، کب تفریح ختم ہوئی اور کب لڑکے اپنی کلاسوں میں چلے گئے۔ میں اُس وقت چونکا جب منشی نے کہا، ’اب تم کو اجازت ہے، گھر چلے جاؤ‘ اور میں گھر چلا آیا۔

اب کیا تھا، مَیں سب کچھ خوش خوش یاد کرنے لگا اور جی ہی جی میں انڈے برابر سفید موتی کے خواب دیکھنے لگا۔ پھر یہ خواب راتوں کو بھی آنے لگے۔ کئی بار ایسے ہوا، مَیں خواب میں موتی کو لیے چھپاتا اور بھاگتا پھر رہا ہوں لیکن نیند سے بیدار ہوتے ہی اپنے خالی ہاتھ دیکھ کر مایوس ہو جاتا۔ اسی عالم میں مجھ پر دن اور مہینے گزرنے لگے۔ پہیلیاں پڑھیں، کلیلہ و دمنہ پڑھی، بیتال پچیسی اور بیتال بتیسی حفظ کی۔ کچھ منتر جلدی یاد ہو جاتے تھے اور کچھ دیر میں۔ خاص کر جو شعروں میں تھے، وہ منٹوں میں حفظ ہو جایا کرتے۔ دن مہینے اور مہینوں نے چار سال کا منہ دیکھ لیا۔ پیپل کی جڑ، جس پر میں بیٹھتا تھا، وہ گھِس کر ماسٹر فضل حسین کی لاٹھی کی طرح سفید، چمکدار اور ملائم ہو گئی۔ مجھے ایک ایک جڑ کا حلیہ اور نقشہ اتنا ازبر ہو گیا کہ ذرا سی تبدیلی کو فوراً بھانپ لیتا اور پیپل کی شاخیں اور اُن پر پرندوں کے گھونسلوں کی تعداد تک یاد ہو گی۔ اب مجھے لاٹھی کی مٹھی کو بھی بلا اجازت چھونے میں جھجک نہ تھی اور میں کئی بار اُس کو پکڑ کے چلا بھی تھا۔

ہم دونوں شام کے وقت قصبے کے مضافات میں نکل جاتے۔ وہ آگے آگے مَیں پیچھے پیچھے۔ باغ، فصلیں، چرواہے، گائیں اور بھینسیں اور اُن کے گلے میں بجتی ہوئی گھنٹیاں، کوئلوں اور فاختاؤں کے نغمے اور قصبے سے جنگلوں کی طرف شام کو اُڑ اُڑ کر جاتے ہوئے ہزاروں پرندے اور کھیتوں سے واپسی پر کسان بیلوں کی جوڑیاں ہنکاتے ہمارے راز داں تھے اور ہم اُن کے۔

پانچ سال گزر گئے۔

دن کیا، رات کیا، مَیں منتر پڑھتے تھکتا نہیں تھا۔ ایسی ہُڑک لگی کہ بعض دفعہ ساری رات جاگتا اور جادو کے ملکوں کی سیریں کرتا۔ آنکھیں سُرخ ہو جاتیں۔ منتر ختم ہونے میں نہیں آتے تھے۔ الف لیلہ، امیر حمزہ کا عمرو عیار، سامری جادو گر اور قصہ چہار درویش، طوطا کہانی، قصہ حاتم طائی، مثنوی سحر البیان اور زہرِ عشق کے منتروں نے وہ رونق پیدا کی اور ایسے ایسے سفید موتی دکھا دیے کہ اُن کے آگے اُستاد جی کے موتی کی کچھ حیثیت نہ رہی۔ اِن منتروں کے علاوہ درسی کتابوں میں بھی لڑکے تو ایک طرف، اُستادوں کے کان کاٹنے لگا۔ ہزاروں ہی شعر، تاریخی قصے، اور حکایتیں یوں زبان سے پھسلنے لگیں کہ سبحان اللہ۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اُستاد فضل حسین کی کھانسی اور خون کی تھوکیں بہت زیادہ بڑھ گئیں۔ وہ لکڑی کی چھوٹی چھوٹی پٹیوں کی قینچی نما کرسی، جس کو تہہ بھی کیا جا سکتا تھا، پر اُسی طرح اکڑوں بیٹھا، مجھے میر اور انیس کی ساحری تک لے گیا۔

ایک دن جب ہم شام کو ٹہلتے ہوئے ذرا ٹیوب ویل کے کنویں تک پہنچے، جس کی نال سے ٹھنڈا پانی شرّاٹے بھر بھر کر ایک حوض میں گر رہا تھا، اُس نے مجھ سے کہا ’اب وہ موتی تمھارے حوالے کرنے کا وقت آ گیا ہے، جس کا تم سے وعدہ کیا تھا۔‘ میں ہنس دیا کیونکہ اب جان چکا تھا کہ موتی کی حقیقت کیا تھی۔ اُس کے پاس کوئی موتی نہیں تھا۔ اُسی وقت اُسے ایک شدید کھانسی کا دورہ پڑا، جس میں بہت دیر تک ہلکان ہوتا رہا اور کھانسی کے ساتھ خون کے چھینٹے پھینکتا رہا۔ یہ ٹی بی کی آخری اسٹیج تھی۔ بڑی مشکل سے مَیں اُسے گھر تک لایا۔ جب اُس کی طبیعت سنبھلی تو اُس کی بیگم نے کہا، ’بیٹا اب تم چلے جاؤ۔ آپ کے اُستاد اب ٹھیک ہیں۔‘ مَیں گھر چلا آیا۔ اُسی رات وہ مر گیا۔ جنازہ ہوا اور پاس کے قبرستان میں دفنا دیا گیا۔ دوسرے دن مَیں نے کہیں سے پیپل کا پودا قبر کے سرہانے لگا کر اُسے پانی دے دیا۔

اُس کے بعد میرا دل اسکول میں نہیں لگا اور مَیں والد سے ضد کر کے دوسرے اسکول میں داخل ہو گیا لیکن چھُٹی کے بعد اور شام کے قریب، جب ہر شے پُر سکون ہو چکی ہوتی اور میرے ہم عمر گراسی گراونڈ میں کھیل رہے ہوتے، مَیں اُس پیپل کے پاس جا کر بیٹھ جاتا اور ناغہ نہ کرتا۔ پرندوں کو روٹیاں ڈالتا اور اُن کے ساتھ مل کر نغمے گاتا۔ اُس ملائم اُبھری ہوئی جڑ پر بیٹھ کر کچھ منتروں کا ورد کرتا۔ اب میں خود بھی اتنا ہشیار ہو گیا کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ساحری کے خزینے اپنے پاس جمع کرنے لگا۔ مَیں چاہتا تھا، زیادہ نہیں تو اپنے قصبے میں کوئی مجھ سے بڑا جادو گر نہ ہو۔ موتیوں کا ایک بے بہا خزانہ میرے پاس اکٹھا ہو گیا، کہ اُس طرح کا ایک بھی میرے کسی کلاس فیلو کے پاس نہیں تھا۔ باغوں، کھلیانوں، ہواؤں، چرواہوں اور جانوروں کے گلے میں بجتی ہوئی گھنٹیوں اور ہلوں سے تلپٹ ہوتی زمینوں سے کیڑے مکوڑے چُنتی لالیوں سے اور ہوا میں قلا بازی کھاتے پرندوں سے میری دوستی پکی ہوتی گئی۔ مَیں خود منتر بنانے لگا، جو گائے بھی جا سکتے تھے اور پڑھے بھی جا سکتے تھے۔ یہ منتر پڑھتا پڑھتا مَیں دوسرے علاقے میں چلا گیا، جہاں مجھے اپنے دور کا سب سے بڑا جادو گر مان لیا گیا۔ اب وہ جِن مکمل طور پر میرے قبضے میں تھا۔ زندگی کے اڑتیس سال نکل گئے اور میں منجھا ہوا گھاگ جادو گر ہو گیا۔ میرے پاس کئی نایاب موتی تھے، جو مجھ سے کوئی چھین نہیں سکتا تھا۔ ایک دن کافی عرصے بعد واپس اُسی قصبے میں آیا، جو اب شہر بن چکا تھا۔ بالکل وہی دن تھے، وہی موسم تھا، مَیں بھی وہی تھا، سکول بھی وہی تھا لیکن وہ پیپل نظر نہیں آ رہا تھا۔ بالکل اِسی جگہ پر تھا، جہاں دیو ہیکل بھدی عمارت کھڑی تھی اور اُس کی پیشانی پر انتہائی سیاہ عبارت میں پرنسپل ڈیپارٹمنٹ لکھا تھا۔ مَیں پیپل کی جڑوں کو بوسہ نہیں دے سکتا تھا، وہ میری دسترس سے باہر تھیں۔ پرندے غائب تھے، پھولوں کی کیاریوں کی جگہ پکی روشیں

بن گئیں۔ سکول کے مضافات غائب ہو کر دور نکل گئے۔ چاروں طرف اُونچی اور بڑی دیوار تھی جس کے اُوپر لوہے کا جنگلا تھا، اُس کے باہر چروا ہے اور بھیڑوں کی بجائے موٹروں اور رکشوں کی چنگھاڑیں اور کثیف دھوئیں کے مرغولے تھے۔ باغوں اور کھلیانوں کو بجری اور لوہے کی عمارتیں کھا گئیں۔ لڑکوں کی تعداد بہت زیادہ اور اُن کی پوشاکیں بدل چکی تھیں۔ اُن کے ہاتھوں میں نوٹس کے بھاری رجسڑ تھے۔

اِتنے بڑے سکول میں نہ کسی استاد کو پتا تھا، نہ پڑھنے والے کو، کہ یہاں کوئی اُستاد فضل حسین بھی تھا، جس کے پاس انڈے برابر سفید موتی تھا۔ نہ کسی کو پتا تھا کہ مَیں کون ہوں؟ اُستاد، طلبا اور سکول کے در و دیوار میں سے مجھے کوئی نہیں پہچانتا تھا، نہ مَیں کسی کو۔

مَیں دبے پاؤں وہاں سے نکلا، سیدھا قبرستان کا رُخ کیا اور اُستاد فضل حسین کی قبر پر جا پہنچا، قبر کے سرہانے کھڑا پیپل کا درخت اب تناور اور گھنا ہو چکا تھا۔ اُستاد فضل حسین کی قبر کے علاوہ ارد گرد کی بیسیوں قبروں پر بھی اُس کی چھاؤں تھی اور شاخوں پر سینکڑوں پرندے چہک رہے تھے۔

***

نظمیں

نظمیں ... مصحف اقبال توصیفی

ناشکری

ہم کو تو جینا بھی اچھا لگتا ہے
لیکن کیوں اچھا لگتا ہے
جب ہر شئے ہم سے چھنتی جاتی ہے
جب پہلے کچھ تھا اور اب کچھ ہے
جب ہر شئے معدوم ہوئی جاتی ہے
جب ہر شئے ...
اب وہ زیادہ تھی یا کم ہو
ایسی کون سی دولت اس نے دی تھی
جس کے چھن جانے کا ہم کو غم ہو

راتوں کو۔
ہم نے دن میں کیا کھویا کیا پایا
ان بے کار خیالوں میں کھو جاتے ہیں
دس بجتے ہیں اور بستر پر
اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر
سو جاتے ہیں

***

یہ کیسی خواہشیں ہیں

یہ کیسی خواہشیں ہیں
جو مرتی ہیں نہ جیتی ہیں
جو میرا خون پیتی ہیں
مجھے جب تیرنا آتا نہیں۔ تو کیوں

مجھے ان زنگ خوردہ الجھے تاروں میں جکڑ کر
(خس و خاشاک کی بے چان روانی میں)
مجھ کو بالوں سے پکڑ کر
ڈبکیاں دیتی ہیں پانی میں

مجھے بہرا نہ کر دے شور موجوں کا
مرے اندر۔ مرے باہر
سمندر موجزن ہے خواہشوں کا
مرے ہی گھر میں۔ خود میرے بدن میں
مجھے بیتاب رکھنے کی
مجھے غرقاب کرنے کی
یہ کیسی سازشیں ہیں

یہ کیسی خواہشیں ہیں
***

ستیہ پال آنند اور میں --- گلزار

چھُٹی کے دن-----
ستیہ پال آنند اور میں
’کوسموس‘۱ جیبوں میں بھر کر
اکثر چاند کے پیچھے والے آسمان میں جا کر کھیلا کرتے ہیں۔

سات ستارے اوپر کے، دو نیچے رکھ کر
نو پتّھروں کا پٹھّو کھیلیں
’کرمچ‘ والی چاند کی گیند اتار کے لے جائیں دونوں!

کبھی کبھی "انٹی" ہوتی ہے۔
یہ وینس۲ کا کنچا ہے
اور وہ جیوپیٹر۳ کا بنٹا!

گلّی ڈنڈا بھی جمتا ہے
چلو، کومیٹ۴ کا ڈنڈا لے کر
منگل۵ تارے کی گِلی سے
گِلّی ڈنڈا کھیلیں گے!

اتنی زور نہ ماریو گِلّی
کانچ زمیں کا ٹوٹ گیا، تو
فِش ٹینک کی ساری مچھیاں
سپیس۶ میں گر کر مر جائیں گی
اور بڑے میاں سے ڈانٹ پڑے گی!
*

۱۔ Cosmos

Venice -۲
Jupiter -۳
Comet -۴
Mars -۵
Space -۶
***

نظمیں --- ستیہ پال آنند

خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

کوئی دروازہ نہیں تھا قفل جس کا کھولتا
سر نکالے
کوئی سمت الراس بھی ایسی نہیں تھی
جس سے رستہ پوچھتا
ایک قوسِ آسماں حّدِ نظر تک
لا تعلق سی کہیں قطبین تک پھیلی ہوئی تھی
دھند تھی چاروں یُگوں کے تا بقائے دہر تک ...
اور میں تھا
اور میں تھا
لاکھ جنموں کی مسافت سے ہراساں بھاگ کر
اعراف کے لا سمت صحرا میں بھٹکتا
کوئی روزن، کوئی در، کوئی دریچہ ڈھونڈتا، پر
یہ بھٹکنا خود میں ہی بے انت، ابد الدہر تھا
ایسی سناتن، قائم و دائم حقیقت
جس سے چھٹکارہ فقط اک اور قالب میں دخولِ عارضی تھا
اس جنم میں جو نئی زنجیر میں پہلی کڑی تھی
ان گنت کڑیوں کی صف بستہ قطاروں سے مرتب
اور میں خود سے ہراساں
یہ کہاں برداشت کر سکتا تھا
جس زنجیر سے میں
تسمہ پا، اک لاکھ جنموں کی مسافت سے صیانت پا چکا ہوں
اس میں پھر اک بار بستہ بند ہو کر چل پڑوں
بے انت جنموں کے نئے پیدل سفر پر؟
ہاں مجھے تسلیم ہے یہ
خانۂ مجنونِ صحرا گرد کی بے در مسافت
میرے ’ہونے‘ اور ’بننے‘ کے گزرتے وقت کا دورانیہ
برزخ کے باب و در سے عاری دشت میں ہی
تا بقائے دہر تک
جنموں کے دوزخ سے رہائی کے لیے ہی
***

آؤ گائیں، ذات کا نوحہ

آؤ گائیں
ذات کا نوحہ
دانتوں میں اک تنکا رکھ کر
روتے روتے سوگ منائیں
آؤ گائیں

اشک بہائیں
خود کو پُرسا دیں
رک رک کر
دیتے جائیں
سبک سبک کر
پھوٹ پھوٹ کر روئیں
دھاڑیں مار مار کر
ٹھنڈے سانس بھریں--- پھر بھرتے جائیں
رک رک کر فریاد کریں--- اور کرتے جائیں
ماتھا پیٹیں اور کراہیں
سسک سسک کر
روتے روتے منہ لٹکائیں
آؤ گائیں

اللہ اللہ، "میری توبہ!" کہتے جائیں
لوٹ لوٹ کر فرش پہ خود جھاڑو بن جائیں
دھاڑیں ماریں، ہاتھ ملیں -- اور ملتے جائیں
کوئی اگر پوچھے یہ گریہ کس کے لیے ہے
حیرت سے دیکھیں اس کو اور پہلو بدلیں
روتے ہنستے--- ہنستے روتے یہ فرمائیں
کھیل کود ہے، خوش طبعی ہے،
ہِپ ہِپ ہُرے--- ہپ ہِپ ہُرے
***

نظمیں --- غضنفر

جڑوں سے اُکھڑنے کا کرب

دل و جاں میں کبھی
ایسا کوئی کلّہ نہیں پھوٹا
کہ اس مٹّی میں کوئی جڑ نہیں اپنی

ہمیشہ ہی لگا ہم کو
کہ ہم بھی تو اسی مٹّی سے نکلے ہیں
اسی کے خون سے سینچی گئی ہے
زندگی اپنی
اسی کا رس رگ و پے میں سرایت ہے
اسی کے لمس سے پودا بنے ہیں
پیڑ کی صورت میں آئے ہیں
اسی سے برگ و بر شاخوں نے پائے ہیں
اسی سے رنگ و بو ہم میں سمائے ہیں
اسی سے گل کھلے ہیں
بزم میں ہم کھلکھلائے ہیں
اسی سے ہم میں رونق ہے
اسی سے جگمگائے ہیں
اسی نے چاؤ سے
ہم کو بھی گوندھا ہے
محبت سے اسی نے گود میں
ہم کو بھی پالا ہے
ہمارے خوں میں اپنا رنگ ڈالا ہے
ہمیں اپنے کسی سانچے میں ڈھالا ہے
کبھی جب لڑکھڑائے ہیں
تو اس نے ہی سنبھالا ہے
کسی بھی طرح ذہن و دل نہیں تیار سننے کو
کہ ہم اپنے نہیں اس گلستاں میں بس پرائے ہیں
ہمارے جسم و جاں میں
ایک بھی ذرّہ نہیں اس کا
ہمارا خون اس مٹّی سے خالی ہے
مگر تلوار ہے سر پر
کہ ہم بولیں بھی ہونٹوں سے
کہ ہم تو اور کے گلشن سے آئے ہیں
کہ اس مٹّی سے کوئی بھی
کسی بھی طرح کا رشتہ نہیں اپنا
کوئی ناطہ نہیں اپنا
کوئی حصہ نہیں اپنا
جو بولیں ہم تو مٹنا ہے
نہ بولیں گر تو کٹنا ہے
***

یہ کس کی روداد

میں کھُلنا چاہتی ہوں

خوب کھُلنا چاہتی ہوں میں
میں اُڑنا چاہتی ہوں
خوب اڑنا چاہتی ہوں میں
فلک کی چوٹیوں پر پاؤں دھرنا چاہتی ہوں میں
بہت کچھ ذہن و دل میں
آسماں پہ جا کے بھرنا چاہتی ہوں میں

ستارے توڑنے کی چاہتیں
مجھ میں بھی پلتی ہیں
قمر کو ہاتھ میں لینے کی خواہش
میں بھی رکھتی ہوں
مرے دل میں بھی یہ ارماں مچلتا ہے
کبھی خورشید کو نزدیک سے دیکھوں
اسے چھوؤں، اسے پرکھوں،
اسے دل میں، نظر میں، جسم میں بھر لوں

ضیا کی تیغ سے سارے اندھیروں کو
جو جسم و جاں میں بستے ہیں
رگ و ریشے کو کستے ہیں
مرے جذبوں کو ڈستے ہیں
مجھے ویران کرتے ہیں
مجھے سنسان کرتے ہیں
مجھے حیران کرتے ہیں
انہیں میں قتل کر ڈالوں

تمنا یہ بھی سینے میں
مرے انگڑائی لیتی ہے
فلک سے روشنی لے کر جو اتروں
اپنی دھرتی پر
سیاہی کے درو دیوار گر جائیں
جو کالے ناگ پل پل من کو ڈستے ہیں
وہ سارے ناگ مر جائیں
ضیاؤں کے نئے گلزار اُگ آئیں
ہر اک جانب نئے اشجار اُگ آئیں
مرے ماتھے سے ایسی چاندنی پھوٹے
کہ جس کے لمس سے
مردہ زمیں میں جان پڑ جاے
کہ جس کی چھاؤں میں
سوکھے شجر کی ڈالیوں پر
پھول کھِل جائے
کہ جس کی نرمیوں سے
طائرِ خاموش کو منقار مل جائے
کہ جس کے قرب سے ہر زخم سِل جائے

فضا میں زمزمے پھر سے سنائی دیں
ہر اک چہرے پہ رنگ و نور کے منظر دکھائی دیں
دلوں کی سیپ میں جو بند ہیں گوہر دکھائی دیں
ڈھکے ہیں دھند سے جو ذہن میں جوہر دکھائی دیں

مگر کیسے اڑوں اوپر
بھروں کس طرح دامن کو
ستاروں سے
فلک کے ماہ پاروں سے
پسندیدہ نظاروں سے
کہ میرے پر کسی پنجرے کے اندر ہیں
کہ پنجرہ بھی کسی گھیرے میں رہتا ہے
کہ جس کی چابیاں اک دیو کے قبضے میں رہتی ہیں
کہ جس کی تیلیاں مضبوط ہیں کافی
کبھی جب جذبۂ پرواز میں طوفان اٹھتا ہے
کبھی جب جوش میں پر پھڑپھڑاتے ہیں
تو ڈینے ٹوٹ جاتے ہیں
***

ہمارے منصب میں --- یاسمین حمید

بعض لوگوں کو اداس پیدا کیا گیا
اور اداس رکھا گیا
تا کہ وہ دنیا کو خوبصورت بنائیں
ہمیں دکھ سے محبت ہو گئی
سورج مکھی کے بیج ہماری مٹھیوں سے پھسل کر زمین میں چٹکے
اور فاختاؤں کے انڈے محفوظ ہوئے
ہم نے حوض کی تصویر بنائی
اور پانی کے رنگ کو بدل دیا
کاغذ کے ٹکڑے ہماری آنکھوں سے گرے تو
چھوٹے بڑے قلم ہماری انگلیوں میں بول پڑے
سارنگی کے تار ہماری پوروں میں پگھلے
اور ہم نے موروں کو رقص سکھایا
جب ہمیں غلاظت سے عطر کشید کرنے کی تلقین کی گئی
تو ہم نے ہجر کا التزام کیا
اور بھیڑ میں غائب ہو گئے
رات کی آخری روشنی کے ساتھ
ہمیں نظم کا عنوان ملا
اور گہری نیند سونے والوں کے ساتھ

ہم جاگنے پر مامور ہوئے
ہمارے منصب میں
دستبرداری کی تاریخ نہیں تھی
اس لیے دنیا کی خوبصورتی یا بدصورتی کے بارے میں
ہم سے کوئی سوال نہ کیا جائے
***

نظمیں ۔۔۔ گلناز کوثر

تم کہاں گئے؟

تم بُری بلا کے پنجے سے
کیوں بچ نہ سکے
کس موہ میں آنکھیں بند کیے
پاپی پاتال میں اتر گئے
کس مُورکھ چَھل نے
دھیان کی جھیل میں
اگن بھری
تُم نُور کے ایک سمندر سے
کیوں ٹُوٹ گئے؟
تُم رُوٹھ گئے؟
کب کام دیو نے مَن کی
پاوَن کُٹیا میں بسرام کیا
کس کپٹی نے کیا منتر
پھونک کے رام کیا
کب پریم کی گاگر پلٹ گئی
بِن جَل کے مچھلی تڑپ اٹھی
تُم شبد نگر کے راجا تھے
اور آتے وقت کے گیانی تھے
تُم راج یوگ کا پربت تھے
اور پنج دریاؤں کا پانی تھے
تُم وارث شاہ کے وارث تھے
رانجھے کی امر کہانی تھے
تُم کھچی کمان کا ناوَک تھے
مَن موہنے اور مَن بھاوَک تھے
تُم بِھیتر میں اک سنیاسی
تُم چار دشاؤں کے باسی
کیوں پتھر کی دیوار بنے
تُم ہار گئے؟
تُم کیسے جھلمل تارے تھے

اور کن راہوں کی دھُول ہوئے
تُم بھول گئے؟
تُم نیل گگن میں پر پھیلاتے طائر تھے
تم پچھلے جنم میں
ایک رسیلے شاعر تھے
***

سوکھا پتا

ہریالی کی قید میں اکثر
یوں لگتا ہے
میں بھی سوکھا پتا ہوتا
ہوا کی ہلکی سی تھپکی پر
زنداں کا دروازہ کھلتا
دھوپ کے اُجلے منظر
میرا تن سہلاتے
رنگ مہکتی کچی مٹی کا
میری بھی روح میں گھلتا
ہوا کی مدھم لہروں پر ہلکورے لیتا
بہتا جاتا
سوکھی چٹخی آنکھیں
کوئی خواب نہ بُنتیں
مُرجھانے کا، جھڑ جانے کا
دل میں کوئی خوف نہ ہوتا
ننھی ننھی جگمگ آنکھیں
مڑی مڑی سی پلکیں
چھوٹے چھوٹے پاؤں
حیرانی سے بڑھتے میری جانب
اور میں بہتا جاتا ---
آتے جاتے قدموں کی آوازیں سنتا
قدموں کی آوازیں جیسے -- دھڑ دھڑ کوئی دھرتی کُوٹے ---
یا پھر وہ آوازیں جن میں سُر گاتے ہوں
یا کچھ جھجھکی، گرتی پڑتی،
مدھم چاپیں ----
دن بھر شہر کی گلیوں میں
یوں خاک اڑاتا -----
گیلی ویراں سڑکوں پر
پھر رات گئے آوارہ پھرتا
اور پیڑوں کی اوٹ میں
ملنے والوں کی سرگوشی سنتا
ہریالی کی قید میں اکثر

یوں لگتا ہے ----
آزادی کا اک دن
پوری عمر کی قید سے اچھا ہوتا
میں بھی سوکھا پتا ہوتا
* * *

نظمیں --- تنویر قاضی

رنگ ریز

جتنے رنگ ہیں
تیرے انگ لگے
اُن رنگوں سے کائنات کا جلتا کینوس
تلچھٹ تلچھٹ
اپنی کاوش اپنے ہی اطراف گرا دیتا ہے
آہستہ آہستہ زائل ہوتے زاویئے اور خطوط
منہ تکتے رہ جاتے ہیں
لا متناہی نیلے خیمے والے
اونٹ بڑے سرکش ہیں
اس تقسیم پر
بندوبست رکھو خیمے کی
رفو گری کا
گُدڑی گُدڑی لعل بھرے ہیں
آنکھیں سپنوں سے خالی
اور ہاتھ تہی تاروں سے
سونپا ہے تو ایک فراق کا رنگ
سطحِ آب کی نیلاہٹ بھاتی ہے
کانٹا کانٹا مچھلی تیرتی
ایک چمک کے پیچھے پاگل ہو جاتی ہے
ماہیِ آب چلی آتی ہے جال کی جانب اپنے آپ
پیلی ساڑھی پہنی آج مچھیرن نے
انگارہ انگارہ دنداسے کی لاٹ میں وہ ناراض لگی اب کے
ملاحوں نے آگ لگا دی
ساحل کی بے سمتی اوڑھے خستہ کشتی کو
پھیکا پڑتا ہے چروا ہے کے خوابوں کا رنگ تو
پھر تعمیر اک تاج محل ہوتا ہے
اے میرے رنگ ریز
خبر ہے؟
کِس گھوڑے سے
لہو لہو فِتراک گِرا ہے ---

***

پھٹے شامیانوں کے نیچے

کبوتر اُڑتے ہیں
دن بھر
شنگرفی جھانجھنیں پہنے
نہیں لاتے کوئی اک خیر کی چِٹھی
بظاہر سامنے اک سُرمئی پنگھٹ ہے
گاؤں گاگریں بھرتا
چرکھڑی کو گھماتا ہے
پرندے زخم منقاروں کے دھوتے ہیں
دلوں کے آستانوں میں
فسردہ ہوتے ہیں کنکر برسنے پر
ہمارے پیٹ پتھر باندھنے کے ہو چکے عادی
ہماری بے لباسی ڈھانپنے کو
پتا پتا چادریں ہم سے لپٹتی ہیں
ابھی نوزائیدہ طائر پڑے ہیں
آشیانوں میں
ہرے پیڑوں کی نیلامی کا پھر سے
ڈھول بجتا ہے
نہیں ہم سے سنبھلتے بانس اس پاگل ہوا میں
یہ ترے اُفتادگانِ خاک
اے شہرِ ستمگر
بے سرو سامان بے گھر
چھُپ رہے ہیں
اپنے ہی جسموں کی دیواروں کے پیچھے
اور دوپٹوں کو بدل کر
دھُوپ اور بارش
سہیلی بن گئی ہیں
بے جھجھک گِرتے شکستہ شامیانوں پر
***

چِڑیا دھُوپ

یاد بھرا
مِٹی کا یہ گُلدان جھاڑتے
ٹُوٹ نہ جائے

تنہائی کے پھُول کی خوشبو میں
وہ
مہکتی ہے
چاول , دال کا دانہ
اور کُوزے کا پانی
دل دیوار پہ
رہنے دو
اَن دیکھی نگری کی
روشن دان سے آتی
اک چِڑیا
دھُوپ کے ساتھ
چہکتی ہے
***

نظمیں ۔۔۔ فرزانہ نیناں

ریت کے پیکر

سرخ پھولوں کی یہ بیلیں
جنگلوں میں اُگ رہی تھیں
دشت کی ہیبت سے خائف
مجھ سے رہتی تھیں گریزاں
چودھویں کی رات میں
خوشبو سے جلتے ہوئے
کتنے جسموں کے ستونوں سے
لپٹنا تھا انہیں
میں نے ان کے رنگ سے
ہر انگ اپنا بھر لیا
دور تک پھیلے ہوئے
ریت کے ذرے سنہرے تھے بہت
تیز ہوا کے جھکڑوں کا شور
اونچا تھا مگر
میں نے اُس منظر میں
تم کو بھی تو دیکھا تھا وہاں
بال ہوا میں اڑ رہے تھے
سرخ پھولوں کی یہ بیلیں
باندھ لیں چپکے سے میں نے
اپنے صحرائی سفر میں
ان کی سوندھی خوشبوؤں کے
پَر لگائے چل پڑی!
***

عشق تماشہ

صبح سویرے جاگی میں
سورج سے اک کرن اٹھا کر
اس سے اپنا منہ دھویا
سارے خوابوں کو بند کر کے
شب کے دریا میں پھینکا
پیڑوں پر گل رنگ پرندے
دل کی بولی بول پڑے
چلتی ہوئی منہ زور ہوائیں
اس لمحے جب مست ہوئیں
خوشہ خوشہ گل گلابی
سوندھی مٹی کی وہ کہانی
اپنے جَلو میں لے کر
میر کی غزلیں گانے لگیں
روح میں تتلی اڑانے لگیں
پھر تم کو اپنے باغ میں دیکھا
دھوکہ تھا وہ اُجلا دھوکہ
گھر کے شیشوں سے کرنوں کا رقص
اندھیرے کو بھاگا
بھول بھلیاں کی گلیوں میں
ایک تماشہ سا جاگا
عشق کی آتش بازی ایسی
تن من جس میں جل جل جائے
دیکھا بھی تو کیا دیکھا
دل میرا دشت میں اک ٹیلہ
وہ عشق تھا، ریت کا میں ذرہ
بس دور دور سے چمکیلا
میں نے آنکھوں کو مسلا
جھرمٹ آنسو کا اترا
کھڑکی کے شیشے ٹوٹے
دو نیناں رہ گئے بھیگے ---!
***

زہر مہرہ

جاں بلب ہوں
درونِ ذات کالا پڑ گیا ہوں
پیاس شدت کی ہے
سینے میں جلن آنکھوں پہ سوجن ہے
گاؤں جب بھی جائیے گا
دادی اماں کو بتا کر میری خاطر
زہر مہرہ لائیے گا
میں نے خود کو ڈس لیا ہے
-- ----

گراؤنڈ زیرو

آگے اک کالا سمندر موجزن ہے
پیچھے صحرا میں بگولے منتظر ہیں
درمیاں جبرالٹر پر
پڑا سستا رہا ہوں
میں اپنی ذات کے
گراؤنڈ زیرو پر کھڑا ہوں!!
***

افسانے
بدلتے رنگ --- اسلم جمشید پوری

یونیورسٹی کے کھلے سبزہ زار میں وہ سب ایک گروہ کی شکل میں بیٹھے تھے۔ نیچے دور تک پھیلی ہری گھاس اور اوپر پیلی پیلی دھوپ گویا ہرے رنگ کے شلوار جمپر اور پیلا دوپٹہ اوڑھے کوئی حسینہ لیٹی ہوئی ہو۔
''یار، یہ کون ہیں۔'' مو ہن نے اکرم کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
''ارے یہ میرے دوست، اصغر ہیں۔ دوبئی میں ایک کمپنی میں منیجر ہیں۔ آج ہی آئے تھے تو میں انہیں یونیورسٹی لے آ یا----'' وہ تھوڑی دیر کو رکا اور پھر اصغر سے مخاطب ہوتے ہوئے اپنے دوستوں کا تعارف کرانے لگا۔
''اصغر یہ موہن ہے۔ ہندی میں پی ایچ ڈی کر رہا ہے۔ یہ سیما ہے، سوری ڈاکٹر سیما ہے۔ ابھی ابھی تاریخ میں ڈاکٹر بنی ہیں اور یہ محسن ہے، ماس کام میں ایم اے پورا کیا ہے۔ ٹی وی کے پروگرام کرتا ہے--------- اور میں، تمہیں خبر ہی ہے کہ اردو میں پی ایچ ڈی کر رہا ہوں-----''
''او کے فرینڈز----- اکرم میرا فاسٹ فرینڈ ہے۔ ویسے میرا تعلق امین آباد، لکھنؤ سے ہے۔ میں نے ایم بی اے کیا ہے اور دو سال سے گلف میں ہوں-----''
تعارف کا سلسلہ ختم ہوا۔ چار دوستوں کی ٹو لی میں ایک اضافہ ہو گیا تھا۔
اصغر نے محسوس کیا تھا کہ سیما اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل کے تار میں ارتعاش سا ہو تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ اصغر اکثر یونیورسٹی آ جایا کرتا تھا کبھی اکرم کے ساتھ اور کبھی تنہا۔ سیما سے بات کرنے کی خواہش ایک دن اچانک خود بخود پوری ہو جائے گی اس نے سو چا بھی نہیں تھا۔ ایک دن وہ منہ میں سگریٹ دبائے اپنی ہی دھن میں یونیورسٹی میں گیٹ سے اندر داخل ہو رہا تھا کہ ایک نقرئی آواز نے اس کے قدم تھام لیے۔
''اصغر صاحب، ہم بھی آ رہے ہیں-----''

اصغر نے سیما کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ پیلے رنگ کی ساڑی میں بے حد دیدہ زیب لگ رہی تھی۔ لمبا قد، دراز گیسو، نکھرا نکھرا رنگ، سیاہ چشمے۔ گویا قیامت سج دھج کر سب کچھ تباہ و برباد کرنے نکلی ہو۔

''جی---------- سیما جی---- آپ-------؟''

''ہاں--- آئیے کافی لیتے ہیں ___''

''چلیں''

دونوں کینٹین پہنچ گئے۔ کافی کا آرڈر دیا اور ادھر اُدھر کے نظاروں میں گم ہو گئے۔ یونیورسٹی میں چہل پہل بڑھ گئی تھی۔ فروری کے آخری دن تھے۔ موسم خوش گوار ہو گیا تھا۔ ٹھنڈ رخصت ہو رہی تھی، گرمی اپنا بستر بچھانے کی تیاری میں تھی۔ راستے، ہرے بھرے لانس، کینٹین سب لڑکے لڑکیوں سے آباد تھے۔ بے شمار رنگوں کے پھریرے تھے جو اِدھر سے اُدھر اڑتے نظر آ رہے تھے۔ باتیں، قہقہے، موسیقی، شور شرابہ، ہارن کی آوازیں ________ سمسٹر ایگزام ختم ہوئے تھے اور نئے سمسٹر سے پہلے کے دن تھے۔ یہ دن موج مستی کے ہوتے ہیں۔ پڑھاکو سے پڑھاکو طالب علم بھی تفریح کے موڈ میں ہوتا ہے۔ فلم، خوش گپیاں، تفریح، کرکٹ میچ وغیرہ میں دلچسپی بڑھ گئی تھی۔

''کافی-------'' بیرے کی آواز پر دونوں چونکے۔

''ارے اصغر صاحب آپ کہاں کھو گئے ہیں؟''

''بس یونہی یونیورسٹی کا نظارہ کر رہا تھا ____اپنا زمانہ یاد آ رہا تھا۔ کیا زمانہ ہوتا ہے؟''

''اصغر صاحب-------''

بھئی یہ صاحب واحب کا سلسلہ بہت ہو گیا۔ میں اصغر اور آپ سیما، بس اور کچھ نہیں ___''

''او کے---------- جی اصغر صاحب---- سوری اصغر--- مجھے آپ کی مدد چاہئے۔''

''میں حاضر ہوں------- آپ بتائیں''

''سنا ہے گلف میں بھی ٹیچنگ کی پوسٹیں آتی رہتی ہیں، مجھے بھی باہر جانا ہے۔ آپ مجھے گائڈ کریں------''

''ہاں--- سیما--- آپ جیسی لڑکیوں کے لیے بہت اچھے چانس ہیں۔''

''میں واپس جا کر آپ کو مطلع کروں گا۔ آپ اپنے کاغذات وغیرہ تیار رکھیں۔''

''واقعی آپ ایسا کریں گے۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا ہے۔'' سیما خوشی کے مارے کھلی جا رہی تھی۔

''سیما---- جب آپ سے دوستانہ تعلق ہو گیا تو سمجھو سب کچھ میری ذمہ داری۔ ڈن----'' اصغر نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''ڈن''

کہتے ہوئے سیما نے بڑی گرم جوشی سے اصغر کا ہاتھ تھام لیا۔ وفور جذبات سے مغلوب دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے میں یوں پیوست تھے گویا دو تھے ہی نہیں۔ دونوں کو ہاتھ چھڑانے کی جلدی نہیں تھی۔ ہوا کا ایک خوش گوار جھونکا دونوں کو چھو کر گذرا اور دونوں کو ایک لطیف احساس کرا گیا۔ بیرا آ گیا تھا۔ اصغر نے پاکٹ سے پیسے نکال کر دئیے اور دونوں اٹھ گئے۔

''اچھا سیما------ پھر ملتے ہیں؟''

''جی---- آپ---------- گلف واپس کب جا رہے ہیں؟''

''اس منتھ کے لاسٹ میں۔ بس پندرہ دن بچے ہیں اور کام بہت زیادہ___''

اور دونوں پھر ملنے کا وعدہ کر کے واپس ہو لیے۔

سیما ایک اوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے والد چودھری رتن لال کی لکھنؤ، لال باغ میں گاڑیوں کے پارٹس کی دکان تھی۔ وہ سنگھ وچار دھارا کے تھے اور لال باغ علاقے کے صدر بھی تھے۔ ان کے دو بچے سیما اور مدن تھے۔ سیما بڑی تھی اور مدن چھوٹا۔ مدن بی اے کر رہا تھا۔ سیما نے تاریخ میں پی ایچ ڈی کی تھی۔ وہ کسی یونیورسٹی میں خاص کر غیر ملکی یونیورسٹی میں جاب کی خواہش مند تھی لیکن وہ اپنی اس خواہش کو دل ہی دل میں رکھتی کہ اس کے پوری ہونے کی امید، نا کے برابر تھی۔ یعنی امید کے پوری ہونے کے درمیان 'نا' حائل تھا۔ مگر جب سے اس کی اصغر سے ملاقات ہوئی تھی، اسے 'نا' کے ہٹ جانے کی امید ہو چلی تھی۔ یوں بھی اصغر اسے پہلی نظر میں ہی بھا گیا تھا۔ کیا خوبرو نوجوان تھا۔ تقریباً چھ فٹ لمبا قد، گورا رنگ، چہرے پر ہلکی سیاہ داڑھی۔ وہ اصغر کو دل ہی دل میں پسند کرنے لگی تھی۔ پسند کرنے سے پہلے اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اصغر اس کے مذہب کا نہیں ہے۔ ویسے پیار کرنے والے یہ باتیں سوچا بھی نہیں کرتے۔ سیما نے اصغر کو لے کر خیالی دنیا بھی بسانی شروع کر دی تھی۔ اگر اصغر کی مدد سے مجھے گلف کی کسی یونیورسٹی میں جاب مل جاتی ہے تو میں اور اصغر، اپنی دنیا الگ بسا لیں گے۔ مجھے جس طرح کے شہزادے کی تلاش تھی وہ اصغر ہی ہے۔ اپنے والد کو بھی سمجھا لوں گی۔ مان جائیں گے وہ۔ میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ وہ سوچتے سوچتے اپنی سیماؤں سے باہر چلی گئی تھی۔

دوسری طرف اصغر کا حال بھی سیما جیسا ہی تھا۔ اصغر کو امید نہیں تھی کہ اسے سیما جیسی خوبصورت ٹال فگر لڑکی یوں اچانک دوست کی شکل میں ملے گی۔ اصغر ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے والد شہر کے معروف عالم تھے جن کی تقریر سننے لائق ہوتی تھی۔ بحیثیت مقرر ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ گھر میں مذہبی ماحول تھا۔ تعلیم کے معاملے میں بھی ان کا گھر مثالی تھا۔ اصغر کے والد خود بھی اردو میں ایم اے تھے۔ اصغر کی والدہ نے بی اے کیا تھا۔ اصغر نے ایم بی اے میں یونیورسٹی ٹاپ کیا تھا۔ اس کے باوجود اصغر نے اپنے گھر کی روایتوں کو نہیں چھوڑا۔ ایم بی اے کرنے کے کچھ ماہ بعد ہی اسے گلف میں ایک بڑی کمپنی میں ملازمت مل گئی تھی۔ گھر میں نئی روشنی کا استقبال بھی تھا اور اپنی تہذیب و روایت کی پاسداری بھی۔ وہ جب کبھی چھٹیوں میں آتا تو اکرم کے ساتھ گھومنے پھرنے کا پروگرام بنا لیتا۔ لکھنؤ کے تقریباً سبھی مقامات وہ گھوم چکے تھے۔ پہاڑوں کی بھی خوب سیر ہو چکی تھی۔ اکرم اکثر اسے یونیورسٹی چلنے کو کہتا مگر وہ ہمیشہ ٹال جاتا تھا۔

''یار وہاں میں کیا کروں گا۔ وہاں تمہارے دوست ہوں گے--- میں ان سے کیا بات کروں گا۔''

لیکن اس بار اکرم اسے یونیورسٹی لے ہی آیا اور اپنے دوستوں سے ملاقات کرائی۔ اصغر کو یونیورسٹی کا ماحول بہت اچھا لگا۔ وہ اب اکرم کے ساتھ اور کبھی خود بھی ادھر آ نکلتا۔ سیما سے جان پہچان، ملاقات، دوستی جب مزید شدت اختیار کرنے لگی تو بے چینی اور اضطراب بڑھنے لگا۔ اب اکثر وہ دونوں ساتھ ہوتے۔ کبھی بھول بھلیاں میں گم ہوتے اور کبھی ایک دوسرے کو اچانک چھو لیتے۔ بارہ دری کے لان، کافی ہاؤس کی کرسی میزیں، حسین آ باد کے کیفے، سہارا مال، فن مال، گومتی نگر--- سب ان کی موجود گی درج کر چکے تھے۔ وہ دونوں خود بھی ایک دوسرے کے دل سمندر میں کافی اندر تک اتر چکے تھے۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ دونوں قربت کی سڑک پر مخالف سمتوں سے آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک اصغر کے واپس جانے کا دن قریب آ گیا۔ ویسے یہ اچانک تو نہیں تھا مگر دونوں، ایک دوسرے میں ایسے گم تھے کہ انہیں یہ احساس ہی نہیں تھا کہ ہر وصال کو ہجر ہے۔

''ارے سیما------- یار مجھے پرسوں واپس جانا ہے-------'' اصغر نے سیما کا ہا تھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''اصغر------ تم اتنی جلدی کیوں جا رہے ہو--- ٹکٹ آگے بڑھوا لو نا---------- میں تمہارے بغیر کیسے رہوں گی۔''

''جان--- کمپنی اور چھٹی نہیں دے رہی۔ میں نے Try کیا تھا۔ مجبوری ہے ور نہ کون کافر ہو گا جو تم سے دور رہ کر سکون سے رہ پائے۔''

''اب باتیں نہ بناؤ---------- میری جاب کا خیال رکھنا، میں کل تمہیں اپنے کاغذات دے دوں گی۔ گلف کی کسی بھی یو نیورسٹی میں---- پھر ہم دونوں ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔''

اصغر کبھی سیما کے جذبات اور اپنی محبت کے بارے میں سوچتا اور کبھی اپنے گھر والوں کے بارے میں۔ غیر مذہب میں شادی کے لیے اس کے والدین کبھی تیار نہ ہوں گے۔ سیما کو لے کر وہ عجیب ادھیڑ بن میں تھا۔ ویسے سیما ہر طرح سے ایک اچھی بیوی بننے لائق تھی۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ اگر وہ سیما کے سامنے مذہب تبدیل کرنے کی بات رکھے گا تو وہ بھی مان لے گی۔ لیکن اسے اپنے والد سے بات کرنے میں ایک طرح کا ڈر محسوس ہوتا تھا۔ پھر بھی اس نے سوچا یہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ وہ جب سے سیما کے قریب آیا تھا، اس کے ذہن میں ایک نئی دنیا آ باد ہو رہی تھی۔

اصغر کو دبئی آئے کئی دن ہو گئے تھے۔ اس کا دل کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ بلکہ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا اس کا دل تو لکھنؤ میں چھوٹ گیا ہو۔ اس نے آتے ہی سیما کے لیے کام کی تلاش شروع کر دی تھی۔ سر دست ایک اسکول میں جگہ مل گئی تھی۔ اس نے سیما کے کاغذات جمع کرا دیے تھے۔ اسکول والوں نے سیما کا لکھنؤ میں ہی انٹرویو کرایا، سیما پاس ہو گئی تھی اور دو مہینے کے اندر سیما، اپنے ملک کی سیماؤں سے پرے، اپنے دوست، کی دنیا میں داخل ہو چکی تھی۔ سیما نے اسکول جوائن کر لیا تھا۔ کچھ دن بعد دونوں ایک مال میں ملے تھے۔

''سیما---'' اصغر خوشی سے بے قابو ہو رہا تھا۔

''جی------ اصغر'' دونوں مضطرب روحوں کی طرح ملے تھے۔ بھرے پرے مال میں گلے نہیں مل سکتے تھے۔ ہاتھ ضرور ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔

''سیما مبارک باد!------- ہندوستان کے بعد آج مل رہے ہیں۔ اب آگے کیا کرنا ہے؟''

''اصغر------ مجھے کچھ نہیں کرنا، جو کرنا ہے وہ تمہیں ہی کرنا ہے۔''

''چلو شادی کر لیتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے---''

''پر تمہیں اسلام میں داخل ہونا ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ بنا کسی دباؤ کے تم اسلام قبول کرو۔ ویسے جو تم چاہو---''

''اصغر مجھے تمہارے نام کے meaning پتہ ہیں (تم نے ایک بار بتایا تھا) تم صرف نام کے اصغر ہو۔ تمہارا دل بہت بڑا ہے۔

میں چاہوں تو سیما رہتے ہوئے بھی، ہم شادی کر سکتے ہیں۔ لیکن مجھے تم اور تمہارا مذہب پسند ہے۔ میں اپنی مرضی سے اسلام قبول کرتی ہوں۔''

دو چار دن کی خانہ پُری کے بعد سیما سے ثنا بنی دلہن اپنے مجازی خدا اصغر کے یہاں آ گئی تھی۔ دو مذہب ہی ایک نہیں ہوئے تھے بلکہ ایسا لگ رہا تھا گویا زمین و آسمان کا ملن ہوا ہو۔ دو انسانوں کے اس ملن پر قدرت بھی مہربان تھی۔ برسوں بعد دبئی کے آسمان پر کالے کالے بادل نظر آئے اور اتنے ٹوٹ کے بر سے کہ سب کچھ جل تھل کر دیا۔ پیاسی روحوں کو قرار آ گیا تھا۔ دونوں نے اپنے اپنے گھر خبر کر دی تھی کہ انہوں نے شادی کر لی ہے۔ لکھنؤ میں تیز ہواؤں کے ساتھ زبردست طوفان آیا تھا۔ درخت، بجلی کے کھمبے، اشتہارات کے بورڈنگس، ٹین کے چھپر سب اپنی جگہ چھوڑ رہے تھے۔ ایسا طوفان کہ جانے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ سب کچھ خاکستر کرنے پر تلا تھا۔

سیاسی اعتبار سے بھی لکھنؤ کی سر زمین طوفان سے ہم آہنگ ہوئی تھی۔ سنگھ کی حمایت وا لی پارٹی اقتدار میں آ گئی تھی۔ مسلمانوں کی حمایتی پارٹی کی بری طرح شکست ہوئی تھی۔ لال اور ہرے رنگ پر زعفرانی رنگ نے بازی مار لی تھی۔ پورے ملک میں زعفرانی جھنڈے لہرا رہے تھے۔ لکھنؤ زعفرانی رنگ کی کثافت کی سب سے بڑی شناخت بن کر ابھرا تھا۔ کیا شہر، کیا قصبہ اور دیہات ہر جگہ زعفرانی رنگ کے جلوے تھے۔ پورے صوبے کا ماحول تیزی سے تبدیل ہو رہا تھا۔ عجیب و غریب قسم کے نعروں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔

''بھارت میں رہنا ہے تو ہندو بن کر رہنا ہو گا۔''

''ایک ملک، ایک دھرم۔۔۔''

''دیش ایک، قانون ایک۔۔۔۔۔۔۔''

''لو جہاد نہیں اب۔ گھر واپس ہوں سب۔''

شہر کا ما حول خراب کرنے کی بھی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ مسلمان لڑکوں کے ساتھ ہندو لڑ کی دکھائی دے جاتی تو بس سمجھو کہ آفت آ گئی۔ کہیں پتہ چلتا کہ کسی مسلم لڑ کے نے ہندو لڑ کی سے شادی کر رکھی ہے تو لڑ کے لڑکی دونوں کو زد و کوب کیا جاتا۔ شادی ختم کرا کر لڑ کی کو اس کے گھر بھیج دیتے۔ اس کے بر عکس اقلیتوں کی لڑکیاں اور عورتیں محفوظ نہیں تھیں۔ کہیں نقاب میں کوئی عورت نظر آ جاتی تو اسے پریشان کرنا عام سی بات ہو گئی تھی۔ سنگھ کے بڑے لیڈر اپنی آ بادی بڑھانے کے لیے اپنی قوم کو اکسا رہے تھے۔

''ہم دو، ہمارے پانچ____''

سوامی آنند اپنی زہریلی تقریر میں مسلمانوں کو برا بھلا کہتے اور ہندوؤں کو اپنی تعداد بڑھانے کے لیے حوصلہ دیتے۔

''دیکھو بھائیو۔ ہم ہندوؤں کی تعداد اگر اسی طرح کم ہوتی رہی تو ہم اکثریت سے اقلیت میں بھی آ سکتے ہیں۔ اس لیے کچھ بھی کرو، زیادہ سے زیادہ اولادیں پیدا کرو۔''

کچھ سنگھ والوں کی یہی ڈیوٹی تھی کہ وہ پتہ لگائیں کہ کس ہندو لڑکی نے مسلم لڑکے سے شادی کی ہے۔ کون کب مسلمان ہوا ہے اور کوشش کر کے ان کی گھر واپسی کرائی جائے۔ اس کے لیے جو بھی کرنا پڑے، کریں۔ ایسے ہی ایک ورکر کو خفیہ ذرائع سے علم ہو گیا کہ پارٹی کے پرانے ورکر رتن لال کی بیٹی نے کئی سال قبل گلف میں اپنے مسلم دوست سے شادی کر لی ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ رتن لال کے گھر فون کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ پارٹی کے بڑے چھوٹے لیڈران کی آمد بڑھ گئی۔ رتن لال عجیب کشمکش میں تھے۔ ایک طرف جگر کا ٹکڑا تھا تو دوسری طرف پارٹی۔ ایک بڑے لیڈر سے خفیہ میٹنگ میں کچھ باتیں طے ہو گئیں۔

سیما، اپنے والد کے فون پر حیران بھی تھی اور خوش بھی کہ ان کی شادی کی خبر کے کئی سال بعد اس کے والد کا فون آیا تھا۔ وہ تو مایوس ہو چکی تھی کہ اب وہ اپنے والدین اور بھائی سے کبھی نہیں مل پائے گی۔ اس کی شادی کو پانچ سال کا عرصہ گذر چکا تھا۔ اس دوران وہ ایک پیارے سے بیٹے احمر کی ماں بن چکی تھی۔ اس کے والد نے فون پر بڑی جذباتی باتیں کی تھیں۔

''سیما۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بیٹی''

''جی پاپا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔'' آنسو سیما کی آنکھوں کی حدوں میں قید نہ رہ سکے۔

''بیٹے تمہیں اپنے باپ، ماں اور بھائی کی یاد نہیں آتی۔ تم کتنی پتھر دل ہو گئی ہو۔'' اُدھر آواز رندھ رہی تھی۔

''نہیں پاپا۔۔۔ مجھے لگا آپ لوگ مجھے معاف نہیں کرو گے۔ پاپا میں تو آج بھی آپ لوگوں کے لیے تڑپتی ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔'' وہ رو پڑی۔ سسکیاں دوسری طرف بھی پہنچ رہی تھیں۔

''تو آ جاؤ نا۔۔۔۔۔ چھٹی لے لو۔ ایک دو مہینے کے لیے آ جاؤ۔۔۔۔۔۔ ہم سب تمہیں مس کر رہے ہیں؟''

''وہ پاپا۔۔ ابھی آنے میں وقت ہے۔ وہ، اصغر کو چھٹی نہیں مل سکتی۔ انہیں دو مہینے کے لئے امریکہ جانا ہے۔۔۔۔۔''

''بیٹا پھر تو بہت اچھا ہے۔ تم اتنے دنوں کے لیے ادھر آ جاؤ---'' فون، سیما کی ماں نے لے لیا تھا۔
''سیما بیٹے!---------'' وہ روتے روتے بول رہی تھیں۔
کچھ دیر خاموشی بنی رہی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا اب خاموشی کو گویائی مل گئی ہو۔
''جی--------- ماں----'' آنسو رک نہیں پا رہے تھے۔
''اچھا ماں میں آ رہی ہوں----'' اس نے ماں اور باپ کے آنسوؤں کو مایوس نہیں کیا اور طے کیا کہ وہ لکھنؤ ہو آئے گی۔
اس نے اصغر سے بات کی۔ اصغر نے کہا۔
''ثنا، دیکھ لو---- میں تمہیں منع نہیں کروں گا---- مگر احمر کا خیال رکھنا--- وہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے--- اور ہاں ہمارے گھر بھی ہو لینا۔ میں ابو سے بات کر لوں گا۔ ویسے وہ ناراض تو ہیں لیکن میں سمجھا دوں گا۔ تمہیں پتہ ہے میری امی سے کبھی کبھار بات ہو جاتی ہے۔''
''ٹھیک ہے اصغر تم ہم دونوں ماں بیٹوں کے ٹکٹ کرا دو۔''

کچھ دن بعد وقت مقررہ پر سیما جو اب ثنا اصغر بن چکی تھی۔ اپنے بیٹے احمر کے ساتھ اپنے شہر، اپنے وطن یعنی لکھنؤ کے اموسی ائیر پورٹ پر پہنچ گئی تھی۔ ایئر پورٹ پر توقع سے زیادہ بھیڑ تھی۔ لگ رہا تھا کوئی سیاسی لیڈر آنے وا لے ہیں۔ سیما کا بھائی ایئر پورٹ آیا ہوا تھا۔ سیما اس سے مل کر بہت روئی۔ گھر پہنچ کر سیما کا پر تپاک استقبال ہوا۔ اس کے والد، والدہ بھی مل کر خوب روئے۔ برسوں بعد آنسوؤں کے باندھ، کھلے تھے۔
دو تین دن گھر پر سکون سے گذرے۔ ایسا سکون، جس کے لیے وہ برسوں سے تڑپ رہی تھی۔ تین سالہ احمر دو تین دن میں ہی اپنے ماموں اور نانا۔ نانی کو جاننے اور پکارنے لگا تھا۔
دو تین دن بعد اس نے جب اصغر کے گھر جانے کی بات کہی تو اس کے والد کا رخ بدل گیا۔
''سیما------ تم وہاں نہیں جاؤ گی---''
''کیوں پاپا------- وہ میری سسرال ہے۔''
''ہو گی------ ہمارے لیے تم کنواری سیما ہو، بس--- آج سے تمہارا اصغر اور اس کے گھر والوں سے رشتہ ختم--- اور ہاں سن لو------ خاموشی سے گھر میں رہو------ مجھے مجبور نہ کرنا کہ میں کوئی غلط قدم اٹھاؤں، کسی کو فون نہیں کرو گی--''۔ پھر وہ بیٹے کی طرف گھومے----
''اور تم اس کے موبائل اپنے قبضے میں کر لو۔ سم نکال کر توڑ دو۔ دھیان رکھو۔ گھر سے باہر نہ جائے---''
پھر انہوں نے بیٹے کے کان میں سرگوشی کی۔
''سیما کے کاٹو تو خون نہیں۔ وہ بری طرح جال میں پھنس گئی تھی۔ اس نے ایسا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ اصغر کو کیا جواب دے گی۔ اس نے احمر کو اپنی چھاتی سے لپٹا لیا تھا۔ اسی ادھیڑ بن میں نہ جانے رات کے کس پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس نے خواب میں دیکھا، اس کا احمر لہولہان ہو رہا ہے۔ کسی نے اسے چاقو مارا ہے۔ معصوم احمر کی چیخیں گونج رہی ہیں۔ وہ مدد کو پکار رہی ہے---- وہ اچانک گھبرا کر اٹھ گئی۔ اس نے اپنے پاس سو رہے احمر کو مضبوطی سے خود سے بھینچ لیا۔ سارا گھر سو رہا تھا۔ سیما کا دماغ جاگ رہا تھا۔ وہ اٹھی اپنی ضروری چیزیں سمیٹیں اور آہستہ سے احمر کو گود میں لے کر گھر سے با ہر آ گئی۔ با ہر آتے ہی اس نے ایک سمت کو دوڑنا شروع کر دیا۔ ہر آہٹ اس کے دل کی دھڑکنیں بڑھا دیتی۔ کچھ دوری پر اسے ایک آٹو رکشہ نظر آ یا اس نے پوچھا۔
''امین آ باد چلو گے----''
''جی میڈم------''
اور وہ انتہائی پھرتی سے آٹو میں بیٹھ گئی۔ ''بھیا ذرا جلدی چلاؤ------''
دہشت اور خوف اس کے دل و دماغ پر طاری تھا۔ وہ جلد سے جلد اصغر کے گھر پہنچ کر احمر کو محفوظ کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اصغر کا گھر تو نہیں دیکھا تھا مگر اسے علاقہ پتہ تھا۔ پھر اصغر کے والد بہت معروف تھے۔ وہ پتہ لگا لے گی۔ وہ کسی بھی طرح احمر کو دنیا سے بچانا چاہتی تھی۔ وہ اپنے گھر والوں سے بہت ڈر گئی تھی۔ اس نے آٹو امین آباد چوک پر چھوڑ دیا تھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا جسے آوارہ کتے کبھی کبھار توڑنے کی کوشش کرتے اور پھر خاموش ہو جاتے۔ آدھے گھنٹے کی بھاگ دوڑ اور پوچھ تاچھ کے بعد اسے اصغر کے والد کا گھر مل گیا تھا۔ اس نے ڈرتے دل سے ہمت کر کے بیل بجائی۔ تھوڑے انتظار کے بعد دروازہ کھلا--- ایک ادھیڑ عورت کی آواز آئی۔
''کون ہے--- اتنی رات میں--- کیا کام ہے؟''
سیما سمجھ گئی تھی کہ یہ اصغر کی والدہ ہیں۔

''امی---- میں---- آپ کی بہو-----''

''کون ثنا------- ارے اتنی رات کو----- آؤ----- آؤ بیٹا'' وہ ثنا کو اپنے کمرے میں لے گئیں۔ وہ جہاں دیدہ عورت تھیں۔ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ اصغر کے ابو، اصغر کی شادی سے راضی نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے سیما نے اسلام قبول کر لیا تھا مگر وہ بہت ناراض تھے۔ لہٰذا وہ ثنا کو لے کر اپنے کمرے میں آ گئیں جہاں کوئی نہیں تھا۔ اصغر کے ابو اپنے کمرے میں محو خواب تھے۔

رتن لال صبح اٹھے تو انہیں گھر کا صدر دروازہ کھلا ہوا نظر آ یا۔ وہ فوراً سیماکے کمرے میں لپکے مگر وہاں خالی پلنگ انہیں منہ چڑا رہا تھا۔ ان کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ پل بھر میں ہی گھر جاگ گیا تھا۔ گھر کی بات پڑوس میں بھی پھیل چکی تھی۔ فون کھنکنے لگے۔ آدھا پون گھنٹے میں ہی پچاسوں نو جوان، لاٹھی ڈنڈے اور دوسرے ہتھیار لیے جمع ہو گئے تھے۔ رتن لال کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ سیما کہاں ہو گی۔ سارا پلان بن چکا تھا۔ گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں پر سوار قافلہ۔ امین آباد چوک پر پہنچ چکا تھا۔

''جئے شری رام۔ جئے شری رام''

''لو جہاد نہیں چلے گا----'' نعروں کی گونج کے بیچ خون کے پیاسے لوگوں نے اصغر کا گھر گھیر لیا تھا۔

''نکالو----- سیما---- کو نکالو-------''

دروازے پیٹے گئے اور لمحہ بھر ہی میں پتھر برسنے لگے۔

محلے والوں کو کچھ بھی خبر نہیں تھی۔ اچانک ہونے والے حملے سے وہ بوکھلا گئے تھے۔ انہیں یہ سمجھتے دیر نہیں لگی کہ شاید اصغر اور سیما آ گئے ہیں۔ کچھ محلے والوں نے بھی جوابی کارروائی شروع کر دی۔ باہر ایک عجیب عالم تھا اور گھر کے اندر-----

اصغر کے والد بہت ناراض ہو رہے تھے۔ وہ سیما پر لال پیلے ہو رہے تھے۔

''تم نے یہاں آ کر اچھا نہیں کیا۔ خدا کے لیے اب تم جاؤ----------''

''ارے آپ ایسے کیسے بہو کو ان ظالموں کے حوالے کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ اسے مار ڈالیں گے۔'' اصغر کی والدہ نے بہو کی حمایت کی۔

''وہ تمہیں اور مجھے بھی مار ڈالیں گے۔ وہ ہتھیاروں سے لیس ہیں۔ ان کے سر پر خون سوار ہے۔''

''امی مجھے جانے دیں۔ آپ احمر کو رکھ لیں۔ اسے بچا لینا''۔ یہ کہتے ہوئے سیما نے اپنی آنسوؤں سے تر آنکھوں کے درمیان بیٹے کو چوما، آنسو کے قطرے چہرے سے نیچے پہنچ رہے تھے۔ اس نے ایک بار احمر کو اپنے سینے سے لگایا اور پھرتی سے دروازہ کھول کر با ہر آ گئی۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

با ہر کھڑے دنگا کر رہے لڑکوں نے اسے پکڑ لیا۔ کچھ اندر گھسنے کی کوشش کرنے لگے مگر اندر سے دروازہ بند کیا جا چکا تھا۔ لڑ کے سیما کو کھینچتے ہوئے ایک طرف لائے۔ رتن لال کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی قدم اٹھاتے، کسی نے سیما کے پیٹ میں چاقو گھونپ دیا، سیما کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں اور خون بہہ رہا تھا۔ آس پاس کے لوگ اپنے گھروں میں دبک گئے تھے۔ اتنے میں کسی نے اصغر کے گھر کو آگ کے حوالے کر دیا۔ آگ نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے شعلے کافی بلند ہو گئے تھے۔ اندر سے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''احمر---------- احمر-----''

چیختی ہوئی ادھ مری سیما جلتے ہوئے گھر میں گھسنا چاہ رہی تھی، اچانک وہ گر پڑی اور روح جسم کی سیماؤں سے نکل گئی۔

پولس کے سائرن سے کچھ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ آگ بجھانے والی گاڑیاں آ گئی تھیں۔ اصغر کا گھر بری طرح جل گیا تھا۔ اب بھی شعلے لہک رہے تھے۔ پولس اور آگ بجھانے والوں نے گھر کے اندر گھس کر اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ اصغر کی والدہ اور والد جل کر دم توڑ چکے تھے۔ ننھا احمر ڈرا سہما سا گھر کے ایک کونے میں دبکا کھڑا تھا۔ آگ وہاں پہنچنے سے پہلے بجھ چکی تھی۔ احمر بد حواس سا کھڑا تھا اس کے کپڑے کہیں کہیں سے جل گئے تھے۔ ایک پولس والا اسے اپنی گود میں اٹھا کر باہر لے آیا۔ باہر خون کی پیاسی نظریں، ہاتھوں میں چمچماتے ہتھیار بے قا بو ہو رہے تھے۔

باہر آتے ہی احمر کی نظر کچھ دوری پر کھڑے رتن لال پر پڑی۔ وہ پولس والے کی گود سے اتر کر، ان کی طرف دوڑا۔

''نانو------ مجھے بچا لو۔ نا۔ ن۔ و۔ و''

لفظ اس کے حلق میں دم توڑ رہے تھے۔

احمر رتن لال کی ٹانگوں میں گھسا جا رہا تھا اور رتن لال کی آنکھوں کا خون، پانی بن کر باہر آنے لگا تھا۔

***

عروسِ فطرت بھرپور جوانی کا جام پیے، سولہ سنگار کیے، سیکڑوں ارمان لیے، چاندی کی ڈولی میں سوار، لیے انکھیوں میں پیار، اپنے سجنا کے دوار، ہولے ہولے کھسک رہی تھی۔ اُس کے خوابوں کا شہزادہ چاند ابلقِ ایام کی لگامیں کسے، ستاروں کے درمیاں بسے، کہکشاں نما راستے پر اپنی منزل کی جانب گامزن تھا، اچانک اسپ ایام لڑکھڑایا، باگیں چھوٹیں، شہزادہ منہ کے بل، اور روح پرواز۔ پھر تو عروس فطرت کی جوانی کے ہاتھوں سے جام چھوٹے، سارے خواب ٹوٹے، ارمان روٹھے۔ اور پھر جیسے ساری دنیا کو روشنی سپلائی کرنے والا ٹرانسفارمر ہی اُڑ گیا ہو۔ پھر تو ساری دنیا میں گھنگور اندھیرا۔ رات ہی رات، کالی کالی، ایک دم سیاہ، چاروں طرف۔ ایسے میں مَنْ دانا کے مطابق: اُن کے چہرے پر جیسے ہی گرما گرم پانی جیسی بدبو دار دھار گری، وہ سوتے سے چونک کر لحاف اچھالتے ہوے اُٹھ بیٹھے۔ دیکھا، تو دو کتّے لپک کر کہرے کی دبیز چادر میں سما چکے تھے، ایک وہ، جو اُن کے لحاف میں سویا ہوا تھا۔ اور دوسرا وہ، جس کے پیشاب کی دھار سے اُن کی آنکھ کھلی تھی۔ مَنْ دانا نے جلدی سے سرکے نیچے سے پیوند لگی چادر کھینچی، اپنے بھیگے اور بدبو دار چہرے کو صاف کیا اور چادر، پیروں کی جانب پھینک کر پانی کی جستجو میں کھڑے ہو گئے۔ پھر اُن کو احساس ہوا کہ کچھ اور بھی کتّے ادھر ادھر سے کھسک رہے ہیں۔ جب اُن کو کہرے کی دھند میں کچھ دکھائی نہ دیا تو انھوں نے پاکٹ سے موبائل نکال کر ٹائم دیکھا، رات کے چار بیس ہو چکے تھے۔ پھر پیروں سے اپنے جوتے ٹٹولے، نہ ملے تو موبائل کی ٹارچ آن کر کے اِدھر ادھر دیکھا نہ ملنے پر افسوس کے ساتھ لمبی سرد سانس کھینچی اور آسمان کی جانب دیکھ کر، کچھ بدبدائے، پھر آنکھیں چار کر کے پانی کی ٹنکی کا دوبارہ جائزہ لیا جو اُن کے شمار سے پرے تھی، پھر سوئے ہوئے لوگوں کی لمبی لائن کا جائزہ لے کر اپنی جگہ کے حذف ہو جانے کے اندیشے سے چپ چاپ اسی لحاف میں دبک کر ماضی میں غرق ہو گئے۔

مَنْ دانا سے میری ملاقات دو سال پیشتر عجیب طور سے ہوئی تھی۔ مَیں اپنا موبائل ٹھیک کرانے خاور الکٹرانک پر گیا تھا۔ وہاں اُن کے بیٹے نے میرا موبائل سرسری طور پر دیکھنے کے بعد کاؤنٹر پر پڑے اخبار کا کونا پھاڑ کر موبائل نمبر لکھ کر مجھے دیتے ہوئے کہا تھا: ’’اس نمبر پر پہلے پتا کر لینا، تب آنا۔‘‘ حالاں کہ ایک صاحب اور بھی جو میرے بعد آئے تھے، اپنا موبائل فوراً ٹھیک کروانے کی اَڑ لیے ڈٹے تھے۔ درخواست تو میری بھی فوراً ٹھیک کروانے کی لگی تھی، بوڑھا ہونے اور پانچ کلو میٹر دور سے آنے کے انکلوزر کے ساتھ پر اس کو میرے ہی بڑھاپے کے پیپرویٹ تلے داب دیا گیا تھا۔

بہ ہر حال تقریباً پندرہ روز بعد فون لگایا، تو مَنْ دانا نے اُٹھایا۔ میرا موبائل تو کیا ہی ٹھیک ہوا۔ مگر وہ ایک اچھے شخص سے ملاقات کے بہانے آ دھمکے، جون کی چلچلاتی دھوپ میں۔ بات چیت کے درمیاں میں نے موبائل کے بارے میں کئی بار دریافت بھی کیا، لیکن وہ کسی نہ کسی بات کو لے کر ٹال گئے، اور جب میں زیادہ پیچھے پڑا تو انھوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ میں بیٹے کی دکانداری میں دخل نہیں دیتا۔ بہ ہر حال میں جب موبائل لینے دکان پہنچا، تو اُن کے بیٹے نے دو سو روپے لے کر موبائل مجھے سونپ دیا، اور جب میں نے چیک کیا تو ویسا ہی تھا، یعنی کہ جوں کا توں۔ شکایت کی تو جواب ملا: چارج ہو گا تب ہی تو چلے گا، نا۔ ۔۔ ؟ بہ ہر حال شک اور خفّت کی ملی جلی سلوٹیں ماتھے پر جمائے گھر آ گیا اور جب چارج کرنے پر بھی نہ چلا، تو پھر پہنچا۔ صاحب زادے بولے: ’’چھوڑ جاؤ۔۔! دیکھ لوں گا۔‘‘ پھر تو ایسا دیکھا انھوں نے کہ مجھے سات پشتیں دکھائی دے گئیں اُن کی۔ آخر ایک دن انھوں نے یہ کہتے ہوئے موبائل پھر میرے سپرد کر دیا کہ اِسے لیے جاؤ۔۔! کسی روز دہلی سے پارٹ لا کر ڈال دوں گا۔ ریپیئرنگ کے دو سو روپے، وہ جو مجھ سے لے چکے تھے وہ، نہ انھوں نے دیے، اور نہ ہی میں نے خیالتاً واپس مانگنے کی ہمت کی۔ بات چوں کہ خاص اہم نہ تھی، لہٰذا میں نے مَنْ دانا سے ذکر کرنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ ویسے بھی وہ بیٹے کی دکانداری میں دخل نہ دینے کا اعلان کر کے اپنا دامن چھڑا چکے تھے۔ ہاں یہ یقین ہے کہ وہ ہر بار کی رپورٹ سے پوری طرح واقف تھے۔ حالاں کہ میں نے کبھی اس گندگی میں کوئی اینٹ اس لیے بھی نہ اچھالی کہ میں اپنے کچھ زخموں کے مرہم بن جانے کی توقع سے اپنی پریشانیاں کا رونا ان کے رو بہ رو اس امید سے روتا رہا کہ شاید کبھی کوئی ایسا راستہ نکل آئے، جس سے میری بے کاری دور ہو سکے۔ ایک دن میں نے ہمت کر کے اپنے بے روزگار ہونے کی بات کہہ ہی ڈالی اُن سے۔ جس کے لیے وہ فوراً اپنی ایک دکان، اِس شرط پر دینے کو تیار ہو گئے کہ میں اُن کی دکان بنوا کر اس میں کوئی کام ڈال لوں۔ چوں کہ میں اپنے موبائل کی ریپیئرنگ کے معاملے میں ان کی خصلت سے دوچار ہو چکا تھا، لہٰذا میں نے اپنی صحت ٹھیک نہ ہونے کا بہانہ لے کر دکان بنوا کر کوئی کام کرنے والا راستہ کاٹ لیا۔ لیکن وہ پیچھے پڑ گئے۔ بہ ہر حال میں اِس شرط پر تیار ہو گیا کہ دکان وہ خود بنوائیں، خود موبائل لائیں، میں ان کے بیٹے کے ساتھ بیٹھ جاؤں گا۔ وہ میری اِس شرط پر راضی ہو گئے۔ اور جب تین ماہ کے قریب بیٹھنے پر بھی مجھے کچھ نہ ملا، تو میں بنا برتن کھڑکائے، اپنی بیماری کا بہانہ لے کر بیٹھ رہا۔

من دانا کی خصلت میں تھا کہ وہ دوسروں کے پٹاروں میں سانپ بچھو دکھا کر، اپنا الّو سیدھا کرنے کے ارادے سے دوسروں کی کٹی پتنگ کے گرد اپنی پتنگ منڈراتے لے جاتے اور دوسرے کی کٹی پتنگ کو اپنی پتنگ میں پھانس کر آہستہ آہستہ کھینچ لاتے۔

میری بیٹیوں کے داخلے انھوں نے ہی کروائے تھے، ہم درد بن کر۔ لیکن بھاری ڈونیشن کے ساتھ یہ پتا مجھے بعد میں لگا کہ میں اُن کے ذریعے داخلے نہ کرواتا، خود کوشش کرتا، تو بہت کم میں نمٹ جاتا۔

ایک بار اُن کی بہو کا پرس، تھری وہیلر میں رہ گیا، مَنْ دانا کی ایک کال پر، پرس گھر آ گیا۔ لیکن جب چوبیس ہزار روپے کے ساتھ میری اٹیچی تھری وہیلر میں رہنے کی اطلاع ان کو ملی تو انھوں نے فون پر مجھ سے خود رابطہ کر کے اٹیچی کے متعلق تفصیلی معلومات تو کر لی، لیکن میرے بار بار گڑگڑانے پر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے، اور جب مَیں نے خود چھان بین کی، تو اٹیچی تو مل گئی، لیکن سامان کے متعلق پتا چلا کہ میرا کوئی دوست پہلے ہی رقم بٹا لایا۔ اس زخم کی ٹیس اتنی تیز اُٹھی کہ مَیں نے تلخ کلامی کر ڈالی مَنْ دانا سے، لیکن اُن کی شخصیت پانی پڑے بیگن جیسی ہی رہی۔ ہاں دو چار روز کے لیے غائب ضرور ہو گئے، مگر پھر آ دھمکے۔ اُن کا کہنا تھا کہ تعلقات ہموار رکھنے میں ہی عافیت ہے۔

مَن دانا محلے کے سب سے رئیس انسان تھے، اُن کا کہنا تھا: ’’محلے میں سب سے زیادہ رقم میرے ہی پاس ہے۔ لکھ پتی تو ہوں ہی۔ اور اب بخار چڑھا ہے کروڑ پتی بننے کا۔‘‘

’’مگر کرو گے کیا: اتنی رقم۔۔؟‘‘ ایک روز سردی میں کپکپاتے آئے تو مَیں نے پوچھ لیا۔

’’میرے سامنے والے نے اپنی بیٹی کی شادی میں دیوروں اور جیٹھوں کو ٹو وہیلرز دی ہیں، جناب۔‘‘

’’اورآپ نندوئیوں کو بھی دیں گے۔۔؟‘‘

’’جی ہاں۔ ۔ !وہ تودوں گا؛ مگر ٹو وہیلرز نہیں: فور وہیلرز۔‘‘ مَنْ دانا نے ؛سامنے چائے لیے کھڑی میری چھوٹی بیٹی کے بجھے بجھے چہرے سے دیکھنے کے انداز کو بڑے غور سے دیکھ کر کہا، اور مَیں نے دیکھا اُن کے دیکھنے کا انداز، بڑے ہی غور سے۔

’’انکل آپ تو کانپ رہے ہیں، اتنی سردی میں، اِنر اور موزے وغیرہ تو پہن لیے ہوتے۔‘‘ میری بیٹی نے کہتے ہوئے، شرما کر میرے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے مَنْ دانا پر چوٹ کی، اور میں خوشی سے اچھل پڑا۔

’’ہے ہی کہاں سردی اتنی۔۔؟‘‘ مَنْ دانا نے اپنی کپکپی پر کنٹرول کرنے کی نا کام کوشش کی، جس کو دیکھ کر میری بیٹی مسکرا دی اور میرا سینہ پھول گیا۔

مَنْ دانا میرے یہاں تو آتے رہے، لیکن اپنے یہاں کبھی نہ بلایا مجھ کو، کبھی اتفاقاً اُن کی طرف گیا بھی۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ گھر پر ہی نہ ہوتے، اور ہوتے بھی، تو کسی سے نہ ہونے کا کہلوا دیتے، یا فون پر کہیں اور ہونے کی اطلاع دیتے، اور اگر کبھی دھوکے سے مل بھی جاتے تو وہ کبھی نماز کے بہانے، کبھی دودھ لینے کے بہانے، کبھی کسی کی دوا لینے کے بہانے، تو کبھی کچہری کی تاریخ کے بہانے، نکل جاتے۔ کسی بچّے کی سال گرہ میں ایک بار بلایا بھی، تو ایسا روکھا رویّہ اپنایا کہ بس یعنی کہ تقریناً ایک گھنٹہ تو باہر کھڑا رہا، پھر شرمائے سٹّے اُن کے بیٹے نے بیٹھک کھول دی، مگر وہ خود منہ پھلائے رہے۔ آخر کو مَیں دوبارہ واپس آنے کا بہانہ بنا کر اِس تہیّے کے ساتھ اُٹھ آیا کہ اگر فون آ بھی گیا، پھر بھی نہ جاؤں گا۔ مجھے جیسا کہ یقین تھا کہ فون نہ آئے گا اور نہ ہی فون آیا۔ مجھے لگا کہ وہ خرچ بچانے کے باعث مہمان نوازی سے کتراتے تھے۔ حالاں کہ اُن کے پاس پیسے کی کمی نہ تھی۔ پھر بھی رقم پیدا کرنے اور بچانے میں مہارت حاصل تھی اُن کو۔ یہاں تک کہ وہ کسی کو زیادہ تر اپنے موبائل سے کال نہ کرتے، اگر کرتے بھی، تو مس کال۔ پھر اُس کے فون آنے کا بے صبری سے انتظار کرتے۔ مہمان کو زیادہ دیر کبھی نہ بٹھاتے، اور جب بھی کسی کو چلتا کرنا ہوتا، وہ اپنا کوڈ بولتے، اندر سے کسی نہ کسی کے اشارے پر بجلی رانی کھسک لیتیں یا اندر سے آواز آتی: بازار نہیں جانا ہے کیا۔۔۔؟۔‘‘

اسکوٹر پر بھلے بیوی ہی کیوں نہ بیٹھی ہوتی اور کہیں بھی معمولی چڑھائی آ جاتی، تو پٹرول زیادہ خرچ ہونے کے سبب فوراً اسکوٹر روک کر بیوی کو اتار دیتے۔ اور خود پیدل اسکوٹر چڑھاتے۔ راستہ گلی کسی شناسا کو دیکھ بھی لیتے، تو پٹرول کے خرچے کی وجہ سے راستہ کاٹ جاتے۔ کسی نے آوازیں دے کر روک بھی لیا، تو اسے بٹھا کر پہلے پٹرول پمپ پہنچتے، اس سے پٹرول بھرواتے، پھر اسکوٹر اسٹارٹ ہوتا، ورنہ نہیں۔ ایک بار میں نے کلر پرنٹر خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ بولے: ’’میرا لے لو، نیا ہے، بالکل سے‘‘

’’تمھارے پاس نیا۔۔۔؟‘‘

’’ہاں ہاں بالکل ہی نیا، جہیز میں ملا تھا، ایک کو۔‘‘

’’ہے کتنے کا۔۔۔؟‘‘

’’’آپ بیس ہزار، صرف آپ کے لیے۔‘‘

"دس کا تو نیا آتا ہے۔"

"ہے بھی تو اوریجنل، یعنی کہ اصلی پرزوں کا۔ اب کہاں آتے ہیں ایسے۔۔۔؟ اب تو ایسے آتے ہیں کہ آج لاؤ، کل خراب۔"

ایک بار میں ان کے ہی کسی کام سے ان کے ہم راہ کورٹ گیا۔ وہ مجھے ایک وکیل کے پاس بٹھا کر کسی کام کے بہانے نکل لیے۔ ان کے بعد میں بھی چہل قدمی کے لیے نکل پڑا، دیکھا تو دیوار کی آڑ میں آم چوس رہے تھے۔

بیٹے کی شادی کے ولیمے میں خصوصی مہمانوں کی ٹیبل پر اُن کے اپنے لوگ جمے رہے۔ جب کوئی اہم مہمان آ یا، تو اُن کے اشارے پر اُن کے اپنے لوگ جگہ دے کر خصوصی ڈشیں پیش کر دیتے۔ اور عام لوگوں کے لیے آرڈنری کھانا ٹیبلوں پر سجا ہی تھا۔

بیٹی کو بھی معمولی طور سے بیاہ دیا، بنا جہیز کے۔

من دانا کی باتوں کو لے کر میرا اکثر من موٹاؤ ہو جاتا اور وہ ناراض ہو کر کھسک بھی لیتے، لیکن ان کا یہ مون برت زیادہ دنوں اس لیے نہ چلتا، کہ وہ سیاست اور قوم پرستی پر بحث کرنے کے عادی تھے جب تک اس ٹاپک پر جم کر بات نہ کر لیتے، اُن کی روح پیاسی رہتی، ان کا خیال تھا: "ہمارے سیاسی، مذہبی رہبر، ہمیشہ لالچی رہے، جہاں بھی انھیں روٹی کا ٹکڑا دکھائی دیا، دم ہلنے لگی اُن کی۔" جب بھی اِس ٹاپک پر بحث چھڑتی، اُن کا چہرہ لال ہو جاتا، ہونٹ، کپکپانے لگتے، آنکھیں چڑھ جاتیں۔ جسم پسینہ پسینہ ہو جاتا۔ مجھے ہی ڈر کر ٹاپک کلوز کرنا پڑتا۔

نوٹ بندی کے بعد بینک سے نوٹ بدلنے کی لائن میں لگے ہونے کی آج یہ اُن کی دوسری رات تھی، پہلے دن تو اتنی لمبی لائن تھی کہ دھکا مکی میں کئی بار لائن سے باہر جا گرے تھے وہ، باسٹھ سال کی عمر میں۔ اور جب جیسے تیسے لائن کچھ آگے بڑھی تو رات کے آٹھ بج گئے اور بینک بند ہو گئی۔ حالات کے تحت دوسروں کی طرح رات وہیں گزارنے کی ٹھان کر گھر پر فون کر کے لحاف، گدّا اور کھانا منگوا کر کھایا پیا اور وہیں پڑ رہے، بے چارے۔ حالاں کہ اُن کے پاس پیسے کی کمی نہ تھی، لیکن پانچ سو اور ہزار کے نوٹ تو بند ہو چکے تھے، بیوی بچوں میں کھنگالنے پر بھی سو سو کے نوٹوں کی گنتی چوبیس سے آگے نہ بڑھ سکی۔ مگر ان میں ہونا کیا تھا، سب سے ضروری الٹرا ساؤنڈ تھا، پوتے کا۔ اس کے علاوہ روز مّرا کے اخراجات۔ جس کے شمار نے اُن کی نیند اُڑا رکھی تھی۔ آج کا کھانا بِنا نمک کا آیا تھا، گھر سے۔ کیوں کہ کل شام کی افواہ نے بازار میں نمک کو گلہڑی کا پھول بنا دیا تھا۔ یہی سب شمار کرتے ہوئے انھوں نے رات، لائن میں ہی گزارنا مناسب سمجھ کر جیسے تیسے رات کاٹ لی تھی۔ کل کے دن، تو اُن کی قسمت پر پتھر ہی پڑ گئے تھے، لائن میں دن بھر کی دھکا مکی کے بعد جب ونڈو کے قریب پہنچے، تو ان کو لگا کہ شام ہوتے ہوتے ان کا نمبر آ جائے گا۔ لیکن قسمت کا لکھا کہاں جاتا۔۔۔؟ جب بیس بائیس افراد اُن سے آگے تھے، تو بینک کنگال ہو گئی، یعنی نوٹ ختم ہو گئے۔ من دانا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پھر بھی اُنھوں نے اپنے لڑکے کو فٹافٹ فون کیے کہ کہیں نہ کہیں سے کچھ رقم کا انتظام کرے۔ لیکن جہاں جائے بھوکا، وہیں پڑے سوکھا۔ یعنی سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ نوٹوں کی کمی کے باعث سارے دھندے، ساری دکانیں بند تھیں۔ لہٰذا یہ دوسری رات بھی انھوں نے لائن میں ہی گزارنے کی ٹھان لی۔ حالاں کہ اِس عمر میں ایسے بد مزاج موسم سے ہاتھ ملانا اُن کے بس کا نہ تھا۔ پھر پچھلی رات کے موسم نے تو بڑے اطمینان سے ان کا مزاج پوچھ لیا تھا۔ حالاں کہ اُن کا دل چاہ رہا تھا کہ بستر وستر یہیں چھوڑ کر گھر بھاگ جائیں۔ لیکن آگے آنے والے وقت سے آنکھ ملانا اُن جیسے سمجھ دار کے بس کا نہ تھا۔ اِس لیے انھوں نے اپنا بدبو دار چہرہ لیے وہیں رات گزار لینے میں ہی آفیت سمجھی۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ اُن کی قسمت اچھی نکلی اور وہ تیسرے دن بینک سے نوٹ لے کر اپنا بوریا بسترا بغل میں دبا کر ننگے پاؤں میرے یہاں یہ سوچ کر آ دھمکے کہ اگلے روز رقم جمع کرنے کے لیے انہیں پھر لائن لگانا تھی، اسی لیے بستر اتنی دور اپنے گھر لے جانا مَنْ دانا کی دانائی سے پرے تھا۔ اُن کی حالت دیکھ کر پہلے تو مَیں سمجھا: ڈاڑھی بڑھائے، بال الجھائے، بستر دبائے، کوئی پاگل گھُس آیا، غور سے دیکھنے پر مسکراہٹ نے میرے ہونٹوں پر دستک دینے کی جرات کی ہی تھی کہ اُن کی پیشانی کے بل نما ڈَنڈے اور ابرو کے خنجر میرے پیچھے دوڑ پڑے، اور مَیں نے لپک کر اُن کے پیوند لگے لحاف کی جانب یہ کہتے ہوئے ہاتھ بڑھا دیا: "لائیے مَنْ دانا بھائی۔۔! لحاف مجھے دیجیے۔۔!"

میرے کہنے پر اُنھوں نے لحاف کھڑے سے میرے ہاتھوں میں چھوڑ دیا۔ ان کے ننگے پیر دیکھ کر چاہتا تھا کہ اُن کے جوتوں کے متعلق سوال کروں، لیکن اُنھوں نے چپ رہنے کے اشارے کے ساتھ باتھ روم کا رُخ کیا۔ لیکن جب مَیں نے انھیں بتایا: "دو روز سے چھٹّی رقم نہ ہونے کے باعث پانی والا، پانی نہ لایا۔ سامنے میدان کے نل سے پانی منگوا رہا ہوں، ذرا رُک جائیے۔" یہ سنتے ہی دھڑام سے میرے صوفے پر گرے اور چائے کا مطالبہ کر ڈالا۔ جواب میں مَیں نے معذرت کر لی: "چھٹّی رقم نہ ہونے کے باعث دو روز سے چائے بِنا دودھ کے چل رہی ہے۔" تو اُن کا چہرہ اُتر گیا۔ اُن کی حالت کو دیکھتے ہوئے مَیں نے ناریل کے چند ٹکڑوں کے سہارے اُن کو اِس لائق کر لیا کہ وہ کچھ احوال بیان کر سکیں۔ کچھ بتانے سے پیشتر انھوں نے دو ہزار کا ایک نوٹ نکال کر چینج کرنے کو کہا۔ اور مَیں نے جب اُن کا نوٹ تھام لیا تو اُن کے چہرے پر بشاشت ناچنے لگی۔ اور جب مَیں

نے اپنی جیب سے دو ہزار کا نوٹ نکال کر مسکراتے ہوئے چینج کر کے ان کی جانب بڑھایا تو ان کا مُنہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور اُن کے چہرے کی بشاشت حیرت کے سمندر میں فنا ہو گئی۔ اور وہ میرے اس مذاق پر لڑنے مرنے کو تیار ہو گئے۔ پھر اُنھوں نے کچھ سوچ کر نارمل ہوتے ہوئے پوچھا: ’’گھر تک پہنچوا سکتے ہو مجھ کو۔۔؟‘‘

’’لڑکے کو فون کرو۔۔! لے جائے۔‘‘

لڑکے کو تو لائن میں لگا آیا ہوں۔

’’تو کسی اور کو فون کرو نا۔۔!‘‘

’’پیسے ہوں، موبائل میں تب نا۔‘‘

’’ڈلوا لو۔‘‘

’’چھٹّے مانگے گا وہ، دوں گا کہاں سے۔۔؟۔‘‘

’’رکشے تو چل رہے ہیں نا۔۔ ۔ ؟‘‘

’’یہی پرابلم ہو گی نا۔۔! وہاں بھی۔ میرے پاس تو دو ہزار کا نوٹ ہے۔‘‘

اتنی مدد تو کر ہی دوں گا آپ کی۔‘‘ مَیں نے سو کا ایک نوٹ نکال کر اُن کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

’’کیا اس سے زیادہ نہیں کر سکتے مدد۔۔۔؟‘‘ اُنھوں نے نوٹ سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

’’گنجایش نہیں۔‘‘ مَیں نے کہا۔ اور وہ منہ بنا کر اگلے روز آنے کا کہہ کر سرک لیے۔

اگلی شام نو بجے اُن کا لڑکا بستر لینے آ گیا، میرے دریافت کرنے پر اُس نے بتایا: ’’پاپا تو صبح نو بجے ہی آ کر لائن میں لگ گئے تھے۔ لیکن اب بینک بند ہو چکا ہے سولہواں نمبر ہے، اس لیے آج مجھے پھر رکنا پڑے گا۔‘‘

نوٹ بندی سے لوگوں کی زندگی اتھل پتھل ہو گئی تھی۔ رات کا ایک بجا تھا من دانا کی زندگی کی کہانی میرے ذہن میں فلمی پردے کی طرح چل رہی تھی۔

رات ایک بجے من دانا نے بھرائی آواز میں بسکتے ہوئے فون پر بتایا کہ بینک کی لائن میں رات ان کے بیٹے کی موت ہو گئی۔ اور میں نے فوراً بینک پہنچ کر لاش کو ان کے ہمراہ ان کے مکان تک پہنچوایا۔

لیکن مجھے حیرت ہے تو یہ کہ تدفین کے بعد من دانا نے جو میڈیا کو جو نیوز دی اس میں صاف طور سے لکھا، ’’بیٹے کی موت رات بینک کی لائن میں نہیں بلکہ مکان پر ہوئی۔‘‘

***

چھوٹی حویلی --- اعجاز عبید

(نا مکمل ناول کا ایک حصہ)

قاضی عبد الستار کے نام

(1)

مسجد سے فجر کی نماز کے بعد نمازی دھیرے دھیرے مگر اس طرح نکلنے لگے کہ جیسے دل ہی دل میں کہہ رہے ہوں کہ چلو۔ اس جھنجھٹ سے چھٹّی ملی، اب کام سے لگیں گے۔

مسجد کے دروازے پر بوڑھا رحیما گدّی ہمیشہ کی طرح مولوی کریم اللہ کے انتظار میں آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ مولوی اپنی مہندی رنگی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نکلے۔ رحیما کے سیدھے سادے سلام ’’سلام مولبی جی‘‘ کے جواب میں ہر حرف پر عربی کی ع اور ح کا تلفظ ادا کرتے ہوئے روزنامہ ’’زمیندار‘‘ سے سیکھی نستعلیق اردو میں بولے ’’وعلیکم عسلام، کحو رحیما، کیسے حو‘‘

’’ہم کا حال کا پوچھتے ہو مولبی جی، ذرا آسمان کا حال پوچھو...‘‘

رحیما نے مولوی کریم اللہ کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کیا۔

’’پرسال تو بیساکھ میں ہی پانی آوا رہا۔ اس سال تو جیٹھ بھی جاوت ہے۔۔ سیتا پور میں ایک رام داس بابا ہوت رہے۔ اوُ آسن جمائے کے برکھا بلاوت رہے۔ آپ ہوں دعا کریو ... کوئی وجیپھہ...‘‘

’’ جہالت کی بات۔ بس، اللہ سے دعا کرو، وہ دعا ضرور سنے گا، وہ غفور الرحیم ہے۔ ہم بھی دعا کرتے ہیں، تم بھی دل سے دعا کرو۔‘‘

’’ او ہمری بات ناہیں سنت ہے۔ سنتا تو بڑے بھیا جمال بھیا کا بیگھہ بھر بھی ناہیں لے سکت رہے۔ کمال پور سکراواں کے سارے جوار سے ہمرا جی برا ہوئے گوا۔ آنکھن دیکھت کا نا انصاپھی ہووت ہے‘‘

رحیما کی آنکھوں نے یادوں اور خوابوں کے صندوقچے کھول دیئے۔
'' ٹھیک کہتے ہو میاں، بلال بھیا تو تم کو اور سب خدمت گاروں کو جھاڑ جھوڑ کر راج کا اپنا حصہ بیچ کر چل دیئے۔ سنا ہے کوئی پیالی گلاس بنانے کا کارخانہ کھولا ہے دلی میں۔''
'' اب تو سارا راج بگڑ گوا...''
'' ہاں، دونوں بھائی ساتھ ساتھ راج میں رہتے تو راج کا اور دونوں کنوروں کا نام سارے اودھ میں سگوں کی طرح چلتا''
دونوں ماضی کی سرنگوں میں چلتے رہے۔ حالانکہ دونوں کو علم تھا کہ چھوٹے بھیا کنور جمال الدین کا نام اب بھی سکے کی طرح چلتا اور گولک کی طرح بجتا ہے .....

---**---

اگر کبھی بارہ بنکی سے سیتا پور کی طرف جانے والی ریلوے لائن سے آپ کا گزر ہو تو آپ نے دیکھا ہو گا کہ کچھ دیر سفر کے بعد ٹرین ایک سٹیشن پر منٹ بھر کے لئے رکتی ہے۔ اس سٹیشن کا نام کمال پور ہے ....(بارہ بنکی سے سیتا پور سیدھی کوئی ریلوے لائن نہیں جاتی اور نہ کمال پور میں کوئی ریلوے سٹیشن ہے۔ اگرچہ کمال پور یا کملا پور نام کا ایک قصبہ ضرور وجود رکھتا ہے مگر وہاں کوئی ریلوے لائن نہیں ہے۔ یہ سارا علاقہ فرضی ہے، حقیقت کا رنگ دینے کے لئے بارہ بنکی، سیتا پور اور کچھ قصبوں /دیہاتوں کے نام اصلی ہیں،ا ع)
اگر آپ کمال پور کے سٹیشن پر اتریں ... مگر ضروری نہیں کہ آپ کمال پور جائیں ہی... لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی اتفاق کی بنا پر جھمری تلیا، جھنجھنوں یا گوجرا نوالہ.. یا ایسے ہی کسی عجیب و غریب نام کی بستی میں جانا ہو جاتا ہے۔ مثلاً کنور جمال الدین جنہوں نے اپنے راج اور لکھنؤ کے علاوہ کچھ بھی نہیں دیکھا تھا اور خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ کبھی وہ جمہوریت ہند کے دار السلطنت دہلی جائیں گے، اپنے سوتیلے بھائی کنور ہلال الدین کے ساتھ جاگیر کے جھگڑے کے سلسلے میں۔ اسی طرح ممکن ہے کہ آپ کو بھی کمال پور جانا پڑ جائے، وہاں کی سٹیٹ بنک آف انڈیا کی مستقبل میں کھلنے والی کسی شاخ میں یا اس پوسٹ آفس کے پوسٹ ماسٹر کے طور پر جس میں تین چار سال تک فقط محمد پوسٹ ماسٹر کی پرچون کی دوکان بھی ساتھ میں ہی تھی۔
ٹرین کمال پور سٹیشن پر آدھی رات کے بعد پہنچتی ہے۔ اگر آپ اس وقت پہنچیں گے تو آپ کو قصبے کے بازار یا اپنی قیام گاہ تک جانے میں بے حد پریشانی ہو گی۔ اس لئے اکثر مسافر ساری رات سٹیشن کے چھوٹے سے رٹائرنگ۔ کم۔ ویٹنگ روم میں رات بسر کر لیتے ہیں۔ ٹرین کی لمبائی اور پلیٹ فارم کے مختصر ہونے کی وجہ سے بیشتر اوقات اترنے والوں کی بو گی سٹیشن سے بہت دور چلی جاتی ہے۔ چنانچہ جب آپ کو یقین ہو جائے کہ کمال پور کا سٹیشن آ گیا ہے تو آپ بلا خوف و خطر اتر جائیے اور مشرق یا مغرب کی سمت دیکھیے۔ آپ کو دو عدد مٹی کے تیل کے لیمپ پوسٹ نظر آئیں گے جو سیمنٹ کے پلیٹ فارم کی انتہائی حدود کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مگر اس کے دونوں طرف بھی سٹیشن کی سبز ریلنگ دور کھیتوں کے سروں تک چلی گئی ہے۔ ایک لیمپ پوسٹ کے پاس پانی کا نل ہے، دوسرے کے پاس ٹائلٹ۔ دو کمرے ہیں۔ ایک میں ویٹنگ روم اور دوسرے میں سٹیشن ماسٹر کا ساز و سامان۔ اسی کمرے میں پیچھے کی طرف کھلنے والی کھڑکی بکنگ ونڈو بھی ہے۔
کمال پور کے اس سٹیشن سے شمال کی طرف بستی کی سمت ایک کچی سڑک چلی گئی ہے جو کوئی دو فرلانگ آگے جا کر مشرق کی رف کاہلی سے مڑ جاتی ہے اور اسی موڑ سے مغرب کی طرف ایک سرخ بجری والا راستہ ہے جس کا اختتام کوئی دو سو گز دور چھوٹی حویلی کے جہازی پھاٹک پر ہوتا ہے۔ اس پھاٹک پر چاندی کے پتّر چڑھائے گئے ہیں، قیمتی نگینوں سے باریک کام کیا گیا ہے۔ جواہرات الور اور راجپوتانے کے دوسرے مقامات سے لائے گئے تھے اور مین پوری کے ماہر تجربہ کار بوڑھے فن جار ہاتھوں نے جس پر خود اپنے فن کی تصدیقی مہر ثبت کی تھی۔ اور جس پر دلدار علی اپنی کلف لگی سرخ پگڑی، نوک دار کھچڑی مونچھوں اور ہاتھوں میں مٹھ لگی چھڑی سے بقول خود ''ویسرا کے اے۔ سی۔ ڈی'' بنے ہوئے ٹِکے رہتے ہیں۔
اگر آپ ان سے ان کا تعارف پوچھ لیں گے تو بے حد ناراضگی کے اظہار کے ساتھ کہیں گے
''ہم کو چینہن ناہیں کا۔ ہم آلی زناب کنور صاحب کے چوبدار علی دلدار علی ہوت''
اور پگڑی میں کان کے پاس دبی بجھی ہوئی آدھی بیڑی نکال کر اس فخر سے سلگائیں گے کہ آپ کی گولڈ فلیک بھی شرمندہ ہو جائے گی۔

--*--*--

حویلی کے پھاٹک سے کچھ فاصلے پر جنوب کی طرف حویلی کے سامنے والے آنگن میں نیم کے درخت کے قریب لکڑی کے گڑے ہوئے کھمبوں کے سروں پر آڑے ڈنڈے سے لٹکے ہوئے فرشی پنکھے کے نیچے بچھی چار پائی خاموش پڑی تھی۔ مچھر

دانی ہوا سے اڑ رہی تھی اور بستر کے سرہانے رکھے ہوئے چمیلی کے پھول زمین پر گر گئے تھے۔
ننوا پاسی نے پیر کی جنبش سے اپنے لڑکے جھنگو کو اٹھایا جو پنکھے کی رسی کو بغل میں دبانے گُڑی مُڑی سو رہا تھا۔
جھنگو کے کسمسانے سے پنکھا تھوڑا سا ہل گیا۔
"اٹھ بے ... اب لگ سووت ہے۔ رات کو....." پھر کنور صاحب کی نیند کے خیال سے ننوا پاسی نے بیٹے کو ڈانٹنا موقوف کر دیا۔ اور اشارے سے اسے بھاگ جانے کا حکم دے کر جی ہی جی میں گالیاں دیتا رہا۔ جھنگو کا کام یہی تو تھا کہ پنکھے کی ڈوری بیٹھا ہلاتا رہے اور جب کنور صاحب سو جائیں تو خود بھی آ کر سو رہے۔ لیکن پچھلی رات یقیناً جھنگو کی ڈوری پکڑ کر ہی سو گیا تھا۔
پھر کنور جمال الدین کے بدن کو حرکت ہوئی۔ جس کا اعلان کسی ہوئی چارپائی کی چرچراہٹ نے کیا، جیسے کسی طوائف نے صبح صبح انگڑائی لی ہو۔
اس صور نے نیم تلے کھڑے خدمت گاروں کے بے حرکت جسموں میں زندگی پھونک دی۔ سب سے پہلے لکھن رام نے ہاتھ بڑھا کر نیم کی نیچی نیچی شاخوں سے مسواک توڑی اور اس کو درست کرنے لگا۔
اسی وقت مچھر دانی سے کلمہ بلند ہونے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی دلدار علی نے مچھر دانی کے پردے اوپر کو اُلٹ دئے۔ کنور صاحب انگلیاں چٹخاتے ہوئے اٹھے، ایک لمحے کو بیٹھ کر سرخ بے خواب آنکھوں سے شمال کی سمت دیکھا۔ "بھیا، داتون"۔ لکھن رام نے بڑھ کر مسواک پیش کی۔ مگر انہوں نے دیکھا بھی نہیں اور چار پائی سے پیر زمین پر لٹکا دئے۔ ننوا پاسی نے فوراً ان کی چپلیں پیروں میں پہنا دیں۔
کنور جمال الدین ہولے ہولے با وقار قدموں سے چلتے ہوئے شمال کی سمت حویلی کے پھاٹک کی طرف گئے۔ پھر پیچھے مڑے۔ پیچھے پیچھے چلے آنے والے خدمت گاروں کو دیکھا۔ ننوا پاسی پانی کا لوٹا اور صابن دانی لئے ہوئے اور کرامت علی تولیہ سنبھالتے ہوئے چلے آئے تھے۔
کنور جمال الدین کے ہونٹ خاموش رہے، دائیں ہاتھ نے حرکت کی، بوڑھے بالوں کو سنوارا۔ ململ کے چُنے ہوئے کرتے کی آستین اس حرکت سے اونچی ہو گئی اور سونے کی زنجیر باہر لٹک گئی۔ پھر انہوں نے آنکھ کا اشارہ کیا۔
"کمال کو بھیج دو، اس سے تنہائی میں بات کریں گے ہم"
سبھی خدمت گار پھر نیم کے تلے چار پائی کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ کرامت علی زنان خانے کی طرف جانے کے لئے فوراً باہری برآمدے میں داخل ہو گئے جہاں کنور جمال الدین کے اکلوتے صاحبزادے اور سارے راج کے "چھوٹے میاں" اور "چھوٹے بھیا" کا کمرہ تھا اور جو علی گڑھ سے چھٹیوں میں پچھلے ماہ سے آئے ہوئے تھے اور اس وقت اپنے کمرے سے نکل کر رانی دلہن، اپنی اماں جانی کے کمرے میں ان کے پہلو سے لگے بیٹھے کچھ خوشامد کر رہے تھے۔

--*--*--

کنور صاحب کچھ دیر تک جہازی پھاٹک کو دیکھتے رہے۔ پھر آگے بڑھ کر اس کی چکنی نقرئی سطح کو چھوا۔ اس میں جڑے ہوئے بڑے بڑے گول نگینوں کی گولائی پر دائیں ہاتھ کی زمرد کی نقشین انگوٹھی سے سجی انگلی سے سہلایا۔ مسکرائے، اور پھر دور سے آتے ہوئے اپنے بیٹے کمال کو دیکھ کر اپنے چہرے پر اچانک سنجیدگی طاری کر لی۔
کمال کے سلام کے جواب میں "جیتے رہو" کہنے کے بعد کچھ دیر اس کے سرخ و سپید چہرے اور مضبوط بدن کو دیکھا۔ مسرت اور فخر کے پیدا ہونے والے احساس پر قابو پایا اور بولے ......
"رات ہم کو نیند نہیں آئی، صبح ہوتے آنکھ لگی تو ہم نے خواب میں دیکھا....."
وہ رکے۔ کمال نے نظریں اٹھا کر ابا میاں کی سرخ بڑی بڑی آنکھیں دیکھیں اور پھر نظریں جھکا لیں۔
"ہم نے خواب میں دیکھا کہ اس پھاٹک کی چاندی سیاہ پڑ گئی ہے۔ اور اس پریشانی میں ہماری آنکھ کھل گئی"
"مگر ابا میاں ......" کمال نے کچھ کہنا چاہا۔
"ہاں ہم جانتے ہیں ...."
نیلی رگوں والے بوڑھے سفید ہاتھ کی گلابی پوریں پھر سیم و جواہرات چومنے لگیں۔
"تم یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ اس میں ہمارے شمالی ہند کا بہترین سامان استعمال کیا گیا ہے۔ مگر یہ صرف چاندی اور جواہرات ہی نہیں، اس میں جنت مکانی تمہارے دادا جان کا خونِ جگر بھی ہے۔"
وہ ایک لمحے کے لئے رکے۔
"اور تمہاری سگی دادی۔۔ اماں جان مرحومہ سے ان کے پیار کا ثبوت بھی۔ ان کو بڑا غم تھا کہ ان کی زندگی میں ہی اس بڑی نظر آنے والی حویلی کو چھوٹی رانی کی مناسبت سے رعایا نے 'چھوٹی حویلی' پکارنا شروع کر دیا۔ اور ہماری سوتیلی اماں جان

بڑی رانی کے نام سے ان کی چھوٹی سی حویلی کو 'بڑی حویلی' کہا گیا‘‘
کنور جمال الدین کا نچلا ہونٹ اس طرح پھیل گیا جسے مسکراہٹ بھی نہیں کہا جا سکتا۔
کمال سوچنے لگا، ابا میاں کا دل بڑے چچا کی طرف سے کبھی صاف نہیں ہو سکتا۔ پھر اس نے اپنی سوتیلی دادی کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ مگر بیتے دنوں کے کھنڈر میں اس کی سوچیں تمام تر کوششوں کے باوجود بڑی دادی کو تلاش نہیں کر سکیں۔
اس کی سوتیلی دادی۔ بڑی رانی جو دادا حضور کی پہلی بیوی تھیں۔ اور جو دل پر پتھر رکھ کر یہ دیکھتی رہیں کہ ان کی پرانی حویلی کا سارا اچھا اچھا سامان چھوٹی رانی کی نئی حویلی میں پہنچایا جا رہا ہے مگر وہ آخر دم تک اپنی چھوٹی دلہن سے وضع داری کے ساتھ تعلقات نبھاتی رہیں۔ البتہ ایک سل سی ان کے سینے پر اس وقت تک رکھی رہی جب تک کہ بڑے چچا نے اپنے ہاتھوں سے کتبے کی سل ان کی قبر کے سرہانے رکھ دی۔
’’ہمیں اس پھاٹک کی عزت اپنی جان سے عزیز تر ہے .... اور تم....‘‘
کمال چونک گیا۔
’’تمہاری جیب خرچ کے واسطے آم کا ایک باغ ابھی سے تم کو دے دیا گیا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں .... رات ہمیں اطلاع ملی کہ تم نے پورا ایک درخت سلامت اللہ کو راضی کر کے فروخت کر دیا... اور وہ بھی رام دیال مہاجن کو...!‘‘
کنور صاحب کے سینے میں اپنے بھیا صاحب کے خلاف سوچ کی ایک لہر پیدا ہوئی جنھوں نے اپنی زمینیں رام دیال مہاجن کو بخش دی تھیں اور وہ خود بھی زمین دار بن بیٹھا تھا اور خود کو مہاجن کی جگہ پنڈت رام دیال کہنے لگا تھا۔ کمال چپ کھڑا رہا۔
’’تم سمجھ نہیں سکتے کہ آم کی فصل فروخت کر کے تم اپنا جیب خرچ پیدا کر سکتے ہو لیکن زمین.... یا درخت...!‘‘
ان کی آواز بھرّا گئی اور کمال نے خود ہی اپنے ذہن میں ان کا جملہ مکمل کر لیا۔ ’’.... فروخت کرنا ہمارے خاندان کی تاریخ پر ایک بد نما دھبا ہو گا۔ اور ایسی کسی حرکت سے چھوٹی حویلی کے پھاٹک کی چاندی جھوٹی پڑ جاتی ہے اور نگینے جھڑ جاتے ہیں‘‘
’’کیا تم کو اپنی تاریخ معلوم نہیں؟ تمہارا نام، اس راج کا نام آخر کس کے نام پر ہے؟‘‘
کمال سر جھکائے سنتا رہا۔ شاید آم کے ساتھ ہی اس کی بولنے کی قوت کا درخت بھی جیسے اس وقت کٹ گیا تھا....
’’جب شیوخ اودھ نے مغلوں سے ٹکر لی تھی۔ اس زمانے کے ایک جنگ جو، میرے پر دادا، جو نو مسلم تھے، اور جن کا نام کمال الدین رکھا گیا تھا... انہوں نے دریائے گھاگھرا کے کنارے سرکاواں میں ایک ڈھی پر بنی گڑھی میں پناہ لی تھی۔ اور جب مغل بادشاہ کا شکار کے لئے ادھر سے گزر ہوا تھا تو ہمارے بزرگ کمال الدین... خدا کرے انہیں جنت الفردوس میں جاگیر ملی ہو... نے شاہ کے ایک سپاہی سے کہہ دیا کہ ہماری تلواروں میں زنگ لگ رہا ہے اور خون میں ٹھنڈک آنے لگی ہے۔ شاہ سے کہو کہ مغلوں کی جگہ اب ان لوگوں کو سلطنت سے نکال باہر کیا جائے جو تجارت کے بہانے چلے آ رہے ہیں، یہ لوگ رفتہ رفتہ ساری سلطنت پر قابض ہو جائیں گے۔ اور جب واقعی سپاہی نے یہ بات شاہ سے کہہ دی تو وہ پھڑک گئے۔ اسی وقت بلا کر سرکاواں ان کو بخش دیا اور کنور کے نام سے انہیں مخاطب کیا۔ تب سے وہ کنور کمال الدین کے نام سے بجنے لگے .....‘‘
’’کنور کمال الدین کے صاحبزادے سلیم الدین... میرے دادا نے 1857ء میں انگریزوں سے ٹکر لی۔ حالانکہ اس میں بہادر شاہ ظفر کو شکست ہوئی اور رنگون نصیب ہوا تھا لیکن اس سے پہلے وفا داری اور نمک حلالی کے صلے میں سلیم الدین کو سرکاواں کے جوار کا یہ علاقہ بھی بخش چکے تھے جو اس وقت کمولی کہلاتا تھا۔ کنور سلیم الدین نے اپنے والد کے نام پر اسے کمال پور کا نام دیا....‘‘
کنور صاحب ایک لمحے کو ٹھہرے۔ اپنی یادوں کی زنبیل میں ہاتھ ڈالا اور کچھ نقرئی اور زریں مہریں نکالیں، پرکھیں اور پھر رکھ دیں ....
’’وہ صوفی منش آدمی تھے، انہوں نے کمال پور آ کر محض ایک کچی حویلی بنوائی جس کے کھنڈر اب بھی پرانی حویلی کہلاتے ہیں اور جہاں تمہارے ہی نہیں، میرے بچپن نے بھی بہت آنکھ مچولی کھیلی ہے۔ اور پھر ابا حضور کی بنوائی ہوئی یہ چھوٹی اور بڑی حویلیاں، اور یہ پھاٹک جس کی اودھ میں نظیر نہیں .....‘‘
کمال خاموش سنتا رہا۔
’’اور تم....؟ کیا اپنی یہ تمکنت کھو دینا چاہتے ہو؟‘‘
کنور جمال الدین کی آنکھیں اور بھی سرخ ہو اٹھیں
... ’’جاؤ تم سے یہی کہنا تھا....‘‘
کنور صاحب پھاٹک کے پاس کی دیوار سے ٹیک لگا کر کچھ دیر کھڑے رہے اور کمال کو جاتے دیکھتے رہے۔ نیم کے درخت کے پاس اب تک کھڑے خدمت گاروں کو کمال نے اشارہ کیا اور بھاری قدموں سے باہر برآمدے میں داخل ہو کر اپنے کمرے کی سمت چلا گیا۔ کنور جمال الدین کی نظروں نے ہاتھ پکڑ کر اسے برآمدے کے دروازے تک جا کر چھوڑا۔ پھر ان کی نظریں آتے

ہوئے خدمت گاروں کی طرف اٹھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ ان کی طرف بڑھتے، لکھن رام نے تیزی سے بڑھ کر تازہ مسواک پیش کر دی۔

---*--*---

اپنی مسہری پر نیم دراز کمال کو یقین تھا کہ ابا میاں کو ضرور اس کا پتہ چل جائے گا اور وہ یقیناً ناراض ہوں گے۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ علی گڑھ میں مدار گیٹ کی چنی جان نے جو سونے کے جڑاؤ کرن پھول کی پہلی فرمائش کی ہے، اس کو پورا کرنے کے لئے آموں کی فصل کی مکمل فروخت کا انتظار کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں علی گڑھ آئے گا اور لکھنؤ سے کرن پھول لیتا آئے گا۔ اب اس کے علاوہ چارہ نہیں تھا کہ سالم درخت کی لکڑی ہی بیچ دی جائے۔ اور ابھی بھی دیکھا جائے تو کچھ کام نہیں بنا۔ ایک درخت کی قیمت بھی رام دیال کیا دے سکتا تھا، ڈیڑھ سو روپیے دے گیا۔ یہ بھی بہت ہے۔ اور شاید اس نے یہ سوچا ہو کہ کنور صاحب کی عزت کا مختصر سا حصہ خرید لیا۔ اب بھی ڈیڑھ سو روپیے میں جڑاؤ کرن؟ اور وہ بھی چھوٹے بھیا، کنور کمال الدین کی طرف سے چنی جان کو پہلا تحفہ! کرن پھول کے لئے شاید ایک پیڑ کا اور سودا کرنا پڑے گا اور اس طرح کہ ابا میاں کو کچھ پتہ نہ چلے! اماں جانی سے آج صبح ہی کتنا کہا تھا، پہلے تو انہوں نے کوئی خواہش ٹھکرائی نہیں تھی اس کی، لیکن آج کتنی آسانی سے کہہ دیا تھا کہ ''ہمارے پاس کوئی مٹھور دھرا ہے ...!'' کہیں ابا میاں اور اماں جانی کو کچھ شک تو نہیں ہو گیا؟ علی گڑھ میں ہی ٹھا کر عرفان کو تو کہیں پتہ نہیں چل گیا اور انہوں نے غفران چچا سے کہہ دیا ہو اور ابا میاں کو خبر مل گئی ہو! یا محمود آباد راج کے کسی فرد سے تو یہ اطلاع نہیں مل گئی ہو! علی گڑھ میں کم بخت روشن پور، محمود آباد اور مہرولی اور خیر آباد، اور مسرکھ اور بٹولی... کتنی جگہوں کے لوگ... ابا میاں کے دوستوں کے خاندان کے افراد بکھرے ہوئے ہیں جن میں اس کے اپنے دوست بھی شامل ہیں۔
پھر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اتنی سی بات کے لئے، ایک درخت کی فروخت کے لئے اسے سلامت اللہ چچا سے مدد لینے کی کیا ضرورت تھی؟ ان کے غیر بھی یہ کام وہ خود کر سکتا تھا، اور پھر مزید رقم کے لئے اماں جانی کی بھی خوشامد کرنی پڑی!
پچھتاوے اور پریشانی کی باتیں سوچتے سوچتے وہ پلنگ پر مکمل دراز ہو گیا اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ پھر اس نے خواب میں دیکھا کہ چنی جان داغ کی غزل گا رہی ہے۔

ناروا کہیے، نا سزا کہیے
کہیے کہیے مجھے برا کہیے

اس کے پیروں کی پایلیں بج رہی ہیں، ایک ایک گھنگھرو چیخ رہا ہے۔

کہیے کہیے مجھے برا کہیے

اور پھر جیسے چنی جان قریب آ گئی۔ گھنگھروؤں کی آوازوں کی لہریں کانوں میں ابھرنے ڈوبنے لگیں۔
''بھیا!''
اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔
''شربت'' سامنے شبنم کھڑی تھی۔
''لاؤ'' شبنم نے چوڑیاں کھنکھاتا اپنا سرخ ہاتھ آگے بڑھایا، اور شربت کے ساتھ کمال نے اس کی چوڑیوں سے سبز کلائی پکڑ لی۔
''چھوڑئے بھی بھیا....'' شبنم اچانک گھوم گئی اور سبز لہنگا لہرا کر اس کے پیروں سے لپٹ گیا۔

--*--*--

رات کی آمد سے پہلے کی خوش گواری جب باہر آنگن میں پیر پسار کر لیٹنے لگی تو ننوا پاسی نے اس پر پانی کا اتنا چھڑکاؤ کر دیا کہ کچی مٹی کی سوندھی سوندھی صبح صبح کچے مکانوں سے دھوئیں کی طرح نکلنے لگی۔ پھر ننوا نے چار پائی اور بستر بچھا کر کرامت علی کی مدد سے سفید براق چادر بچھا دی اور ٹھیک اسی وقت، جیسے اس سارے وقوعے کی منتظر، منا مالی کی بیوی چمپا چلی آئی۔ چمیلی کے سفید سفید پھولوں کو سبز سبز پتوں اور سرخ و زرد ہاتھوں اور کپڑوں میں چھپائے۔ ننوا پاسی نے اسے دیکھا پھر نظریں پھیر کر اور انجان بن کر کرامت علی سے کہا ''اب لگ چمپا ناہیں آئی''
چمپا ہولے سے مسکرائی اور پلنگ کے سرہانے خود ہی پھول رکھتی ہوئی بولی ''ہم لائے دئے ہیں، کل چمپا کے پھلوا ہوں لائے رکھیہیں۔''
کرامت علی کنور صاحب کو بلانے اندر چلے گئے اور اس جگہ دلدار علی لکڑی کی کھٹ کھٹ کرتا ہوا چلا آیا۔

''اب تو مالک بڑھائے گئے۔ نئیں تو چمپا کے پھلوا کے بنا بستر ماں آئے ناہیں سکت رہے''
دلدار علی نے چمپا کی بات پر آپی بات چسپاں کر دی اور اس کی خوفناک مونچھوں سے گھورے جانے پر چمپا جواب دیئے بغیر تیز قدموں سے چلی گئی۔
پھر کنور صاحب آئے۔ ان کے پیچھے پیچھے لکھنے رام اور کرامت علی تھے۔ ننوا اور لکھنے رام نے جلدی سے برآمدے سے اٹھا کر آرام کرسی اور دو چار مونڈھے لا کر رکھ دیئے۔ پھر دونوں الٹے پاؤں واپس چلے گئے۔ لکھنے رام پہلے لوٹ کر آیا اور آ کر بغیر چلم کا حقہ آرام کرسی کے پاس لا کر رکھ دیا۔ پھر کرامت علی رو مال سے پکڑے ہوئے حقے کی سلگتی ہوئی چلم لے کر آئے۔ چلم حقے پر رکھ، گٹا دبا کر سٹک کی منہ نال کنور صاحب کے سیاہی مائل سرخ ہونٹوں تک پہنچائی۔ دلدار علی نے خود کو حویلی کے پھاٹک کے پاس جا کر اپنا بدن اکڑا کر نصب کر دیا۔ ننوا اور کرامت علی وہیں کھڑے رہے۔ لکھنے رام پنکھا کرنے لگا۔ کنور صاحب نے حقے کے دو چار طویل کش لئے۔ سامنے مغرب کی طرف پھیلنے والی شفق کی سرخی کو دیکھا پھر تھوڑا سا اُٹھ کر خود ہی آرام کرسی موڑی اور اس کا رخ شمال کی طرف کر دیا۔ سیدھے بیٹھ کر انہوں نے اپنی نظریں سامنے اٹھائیں جو دلدار علی کی تنی ہوئی پیٹھ پر جا کر گڑ گئیں۔
کسی چھٹی حس کے باعث دلدار علی نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بیڑی کا بنڈل نکالنے والا ہاتھ جیب سے خالی ہاتھ باہر آ گیا۔
پھر اس نے ایک آواز سنی ''سلامت اللہ کو بلاؤ''
دلدار علی نے سامنے گڑی ہوئی نظروں سے کرامت علی کو جاتے ہوئے دیکھا اور جیسے نظروں سے ہی اس نے سنا....
''مکھتار ساب کو آد کرت ہیں''

--*--*--

کچھ دیر بعد سلامت اللہ مختار اپنی شیروانی کے غلط لگے بٹنوں کو پھاٹک کے پاس رک کر ٹھیک کر کے اندر داخل ہوئے اور سلام کر کے گفتگو شروع کی۔
''سرکار، میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہونے والا تھا کہ آپ کا پیغام پہنچا، وہ در اصل کچھ ایسی خبریں مل رہی ہیں کہ جن پر یقین کرنے کی تاب نہیں اور آپ کے گوش گذار کرنے کی جرات نہیں''
دلدار علی کے جان جیسے قدموں سے چلتے ہوئے مختار صاحب کے ہلتے ہوئے ہونٹوں کے پھاٹک سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔
پھر اس نے کنور صاحب کو تنہائی کا اشارہ کرتے دیکھا اور کرامت علی، ننوا پاسی اور لکھنے رام اندر چلے گئے۔
کنور صاحب اور مختار صاحب کی گفتگو سننے کی کوشش میں دلدار علی اتنا محو ہو گیا کہ پھاٹک سے ٹک کر اندر کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا اور بے دھیانی میں جیب سے بیڑی نکال کر سلگا بھیلی۔

--*--*--

''دیا ری دیا، کا گرمی پڑت ہے، ساری رات نیند ناہیں آئے رہی'' گووندا کی نئی نویلی دلہن گیندا نے صبح صبح دودھ دوہتے ہوئے اپنی نند رام رکھی سے اظہار خیال کیا۔
''سب دیہہ کی گرمی ہے اور کچھ ناہیں'' رام رکھی نے بستر سے آٹھ کر غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے گووندا کو دیکھ کر کہا۔
''ای پڑیا کی.... لپکت آوت ہے'' گیندا نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے بات پلٹ دی۔

--*--*--

فقط محمد پوسٹ ماسٹر نے مولوی کریم اللہ اور رحیما کو آتے دیکھ کر آدھی کھلی دوکان (اور پوسٹ آفس) کو پورا کھول کر ایک پورا اور ایک ساڑھے تین پایوں کا دوسرا سٹول پاس ہی پڑی اینٹ رکھ کر تیزی سے برابر کر کے رکھ دیا۔ مولوی کریم اللہ نے اسے فقط محمد کا سلام سمجھ کر قرات سے جواب دیا ''وعلیکم السلام'' اور بلا تکلف بیٹھ گئے۔
''آج تو مولوی صاحب کچھ لگ رہا ہے کہ بادل چھائیں گے''
''اب تو گرمی کی انتہا ہو گئی فقط میاں، حد ہے یعنی ون کی انیس تاریخ ہو گئی اور مانسون کا پتہ ہی نہیں''
''ایس میگھ تو دو تین بار آئے کے چپ چاپ چلے جاوت رہے'' رحیما نے اظہار خیال کیا۔ پھر تینوں خاموش رہے۔
''آپ بیٹھو مولوی صاحب، میں ذرا حاجی بھیا کو بلا لاؤں کہ وہا کر دوکان سنبھال لیں۔ مجھے سٹیشن سے ڈاک لانی ہے''
''حاجی گل محمد آج پھر فجر میں نہیں تھے'' مولوی کریم اللہ کو دفعتاً یاد آیا مگر فقط محمد جواب دینے کے لئے موجود نہیں تھا۔
--*--*--

صبح کی سیر کے بعد کھیتوں سے گزرتے ہوئے نظریں جھکائے حویلی کی طرف جاتے ہوئے کمال نے ’’بندگی چھوٹے میاں‘‘ کی آواز کی لہروں کو پہلے سر کی جنبش سے منتشر کر دیا، پھر چونکا۔ ’’کون، کشن چاچا! سلام‘‘
اسے شرمندگی ہوئی کہ کشن داس جس نے ابا میاں کو گھڑ سواری سکھائی تھی اور جس کو ’’کشن چاچا‘‘ پکارنے کے لئے ابا میاں کا سخت حکم تھا اور خود سے سلام کرنے کی ہدایت بھی۔
’’کشن چاچا، میں آج کسی وقت آپ کے پاس اتا۔ سہ پہر کو گووندا کو بھیج دیجیے گا کہ تانگہ کھینچ کر لے آئے، سٹیشن جانا ہے‘‘
’’کا میاں علی گڑھ جئیہیں؟‘‘
’’ہاں کشن چاچا، ضروری کام ہے‘‘
کمال حویلی کے پھاٹک کے پاس گھوم کر پیچھے کے راستے سے اپنے کمرے کی طرف جانے کے لئے مُڑ گیا۔
کمرے میں آتے ہی اس نے تکیے کے نیچے سے گولڈ فلیک کی ڈبیا نکالی، ایک سگریٹ سلگائی اور اماں جانی کی آواز قریب آنے پر جلدی سے کھڑکی سے باہر گزرتی مہرو کے رخسار کا نشانہ لے کر پھینک دی۔
--*--*--

لکھن رام نے مسواکیں توڑ لیں اور انہیں چاقو سے درست کرنے لگا، کرامت علی تولیہ اور صابن دانی لا کر کھڑے ہو گئے۔ ننوا پاسی نے لوٹے میں رات کا رکھا 'باسی' پانی پھینک کر ’’کُیّاں‘‘ کا تازہ پانی بھر دیا۔
مچھر دانی کی چھت پر نیم کے دو چار خشک پتے گر گئے تھے۔ اس کے پردے ہوا سے ہل رہے تھے۔ فرشی پنکھا چپ تھا۔
پھر لکھن رام کے ہاتھوں میں مسواکیں سوکھنے لگیں۔ ننوا پاسی نے ہاتھ میں تھامے لوٹے میں تیسری بار کوئی تنکا نکالا۔ دلدار علی نیم کے تنے کے پاس ایک اور نیم کے درخت کی صورت کھڑا ہو گیا اور پگڑی میں دبی بیڑی کو انگلیوں کے پوروں سے چوروں اچکوں کی طرح ٹٹولنے لگا۔
کمال نے جو رانی دلہن کے حکم کے مطابق ابا میاں سے معافی مانگنے چلا آیا تھا، کئی اچھے معذرتی جملے بنا ڈالے۔ سب کنور صاحب کے جاگنے کے منتظر تھے۔
بڑی دیر تک مچھر دانی سے کلمہ بلند ہونے کی آواز نہ آئی اور کچھ ہی گھنٹوں بعد مولوی کریم اللہ نے خود ہی کلمہ پڑھا اور کمال، کرامت علی اور سلامت اللہ مختار کے ساتھ احترام سے کنور صاحب کا جنازہ کاندھوں پر اٹھا لیا۔
***

غزلیں
غزلیں --- فیصل عجمی

یہ آسمان کوئی فسانہ تو ہے نہیں
ہم اس کو دیکھتے ہیں، گرانا تو ہے نہیں

پہنیں گے خاکدان کا زربفت پیرہن
یاروں نے اس کا دام چکانا تو ہے نہیں

مٹھی میں ایک زہر ہے، دنیا کہیں جسے
سب سے چھپائے پھرتے ہیں، کھانا تو ہے نہیں

مانگا ہے عشق بھی من و سلویٰ کے نام پر
اترے گا آسماں سے، کمانا تو ہے نہیں

دوچار لوگ ہیں جو مری آستیں میں ہیں
میرے خلاف سارا زمانہ تو ہے نہیں

گھر جانا چاہتے ہیں کہ مدت ہوئی گئے
کہنے کی اور بات ہے، جانا تو ہے نہیں

کہتا ہوں عشق سے کہ مری جان چھوڑ دے
لگتا ہے مان جائے گا، مانا تو ہے نہیں

کیا علم، چار سُو سے نکل جائے کس طرف
آوارگی کا کوئی ٹھکانہ تو ہے نہیں
***

عمر خیرات ہو گئی میری
در بدر ذات ہو گئی میری

ملنے آئے گی چاندنی بن کر
دھوپ سے بات ہو گئی میری

خود کو کھویا بھی اور بھلایا بھی
مات پر مات ہو گئی میری

اپنے سائے سے خود گریزاں ہوں
اب یہ اوقات ہو گئی میری

ایک آنسو بھی رونما نہ ہوا
ختم برسات ہو گئی میری

میں بناؤں گا خُوب دنیا کو
جب یہ بد ذات ہو گئی میری
***

غزلیں --- فرحت عباس شاہ

(غالبؔ کی زمینوں میں)

صبح الم کہے شب ہجراں اٹھائیے
کس کس جگہ سے درد کا ساماں اٹھائیے

ہم نے کہا کہ تنگ نہ کیجئے ہمیں حضور
کہنے لگے کہ نخرۂ جاناں اٹھائیے

کتنا کہا تھا عشق سے باز آئیے جناب
چلیے اب عمر بھر دل ویراں اٹھائیے

ہے فکر پر غزل کی عمارت کھڑی ہوئی
مصرعے کو چھوڑئیے در امکاں اٹھائیے

ہیں مضمحل قویٰ بھی تو پیری بھی ہے شریک
کیسے عذاب شورش پنہاں اٹھائیے

مہمیز دے رہی ہے بہت خواہش وصال
لیکن کہاں تلک نقد جاں اٹھائیے

تھم ہی گیا ہے واں تو تغافل بہ سوئے چشم
کب تک سکوت دیدہ حیراں اٹھائیے

فرحت تمام شہر ہو در پَے تو کس لیے
ذلت کو ساتھ اپنے گریباں اٹھائیے
***

روز کوشش کرے دل بات بنائے نہ بنے
ہو کے مایوس گرے اور کہے ہائے نہ بنے

آتشِ عشق سلگنے میں الاؤ پہ مصر
اشک آ آ کے گرے شعلہ بجھائے نہ بنے

ان کی خواہش ہے کہ ہو عذرِ معطل پیدا
میں دعا مانگتا رہتا ہوں بِن آئے نہ بنے

راکھ مل مل کے کہے دل کہ مرا حال تو دیکھ
اور تری یاد کہ بِن آگ جلائے نہ بنے

پھیل جاتا ہے ترا وصل مرے چاروں طرف
جب ترا ہجر کہیں سمٹے سمائے نہ بنے

میری خوشیاں کہ مری ہوکے بھی بیگانی رہیں
ہاں مگر درد کہ اک پل بھی پرائے نہ بنے

ذہن الزام کے خدشے کی شقاوت کا اسیر
دل کا یہ حال کہ بِن پردہ اٹھائے نہ بنے

زندگی حسنِ تضادات کی آرائش ہے
ہم کو روئے نہ بنے اس کو رلائے نہ بنے

طبعِ نازک پہ گراں گزرے نہ گزرے فرحت
نالۂ ہجر کی خو ہے کہ سنائے نہ بنے
***

غزلیں --- مہتاب حیدر نقوی

پھر کسی خواب کی پلکوں پہ سواری آئی
خوش امیدی کو لئے باد بہاری آئی

پھول آئے ہیں نئ رت کے نئی شاخوں پر
موجۂ ماہ دل آرام کی باری آئی

نامرادانہ کہیں عمر بسر ہوتی ہے
شادکامی کے لئے یاد تمہاری آئی

اور پھر پھیل گیا رنگ محبت رخ پر
لالۂ زخم لئے یار کی یاری آئی

ایک دن ہم نے زباں کھول دی سچ کہنے کو
اور پھر شامت اعمال ہماری آئی

ہوس و عشق کے احوال رقم کرنے کو
پردۂ شعر میں افسانہ نگاری آئی
***

اس آس پہ زندہ دل نادان رہے گا
گل ہیں تو سدا خواب گلستان رہے گا

یہ بوند لہو کی یونہی ہنگامہ کرے گی
آباد یونہی خانۂ ویران رہے گا

کب غنچۂ امید کھلائے سے کھلا ہے
یہ خواب پریشان، پریشان رہے گا

اب وہ بھی بچھڑتا ہے، بچھڑ جانے، بلا سے
کچھ نفع کا سودا ہے، جو نقصان رہے گا

یہ عیب ہنر یا ہنر بے ہنری ہے
کچھ بھی ہو مگر "نون" کا اعلان رہے گا

اب تختۂ الفاظ پہ مہتاب کی صورت
بلقیس سخن تیرا سلیمان رہے گا
***

غزلیں --- سعید

خوشا کہ محفلِ عرق و ایاغ روشن ہو
ملے ہیں یار تو شامِ فراغ روشن ہو

بھڑک رہی ہے سبھی جا ہوس لکیروں میں
کہیں تو جادۂ دل کا سُراغ روشن ہو

میں تھک گیا ہوں ستارے کشید کرتے ہوئے
خدائے شب مرے سینے کا داغ روشن ہو

کبھی تو یوں بھی شبِ ہجر مجھ کو راس آئے
میں تجھ کو یاد کروں اور چراغ روشن ہو

ہر آگہی میں فروزاں ہے صد شرارِ جنوں
کھُلے نہ عشق تو کیسے دماغ روشن ہو

بہارِ لالہ و گُل مضمحل ہے مدّت سے
وہ ماہ رُخ اِدھر آئے تو باغ روشن ہو

میں روشنی کی وہ تعبیر لکھ رہا ہوں جہاں
ہوا کا ہاتھ پکڑ کر چراغ روشن ہو

نہ کارِ دل ہی سکوں ہے نہ کاروبار سعیدؔ
کہاں سے گھر مرے شمعِ فراغ روشن ہو
***

لگے بھی دل، کسی پہلو مگر سکوں بھی نہ ہو
لہو میں اس قدر آمیزشِ جنوں بھی نہ ہو

کیا ہے جیسے محبت نے دربدر ہم کو
کوئی کسی کی طلب میں خراب یوں بھی نہ ہو

لہو رُتوں میں کہاں سے میں فاختہ کے لئے
وہ شاخ لاؤں کہ جس پر لکیرِ خوں بھی نہ ہو

وہ زخم کیا جو کسی جاں کو روشنی بھی نہ دے
وہ رنج کیا جو روایت گرِ جنوں بھی نہ ہو

وصال و ہجر کے نشّے بدل کے دیکھ لیا
قرار یوں بھی نہ آئے، قرار یوں بھی نہ ہو

ہمیں تو عشق عبادت کا معجزہ ہے سعید
عزیزِ جاں ہیں وہ سجدے کہ سر نگوں بھی نہ ہو
***

غزلیں ۔۔۔ ڈاکٹر رؤف خیر

بادل سہی وہ خاک اڑا کر گزر گیا
جھونکا ہوا کا تھا اِدھر آیا اُدھر گیا

تھا جس کو پار کرنا وہی پار کر گیا
یوں ورنہ کیسے کیسوں کا دریا اتر گیا

میں جانِ انجمن ہوں مری جان قدر کر
آنے کا لوٹ کر میں نہیں ہوں اگر گیا

چہرے ہوئے سراب، رسائل کتاب خواب
ہم کو یہ لاک ڈاؤن تو برباد کر گیا

برگد ہے وہ ضرور مگر بونسائی ہے
گملے میں برگ و بار جو لاتا ٹھہر گیا

اچھا تو یہ جہاد بھی مومن پہ فرض ہے!
صوم و صلوٰۃ ہی کو جو انگیز کر گیا

ہم تو رؤف خیرؔ لگاتے گلے اُسے
وہ بدگمان ہاتھ ملا تے بھی ڈر گیا
***

اُن کا دہن ہے یا کوئی مطلع غزل کا ہے
لب بند ہیں کہ مصرع پہ مصرع غزل کا ہے

ماتھے پہ اُن کے دستِ مرصع غزل کا ہے
اعضائے خوش بدن ہیں کہ مجمع غزل کا ہے

ابرو ہے یا دھنک کے مقابل کوئی دھنک
دیدہ وروں کے حق میں مرقع غزل کا ہے

قربان جائیے یہ نشیب و فراز کے
سینہ کشا یہ مطلع و مقطع غزل کا ہے

اصنافِ نظم و نثر بہت خوب ہی سہی
ہر پھر کے نام اعلیٰ و ارفع غزل کا ہے

اُس کم سخن پہ بار نہ ہو حرفِ آرزو
اظہارِ مدعا پہ ملمع غزل کا ہے

وہ حسنِ بے پناہ اب آیا ہے بام پر
سچ پوچھیئے تو خیرؔ یہ موقع غزل کا ہے
***

غزلیں ... ڈاکٹر فریاد آزرؔ

چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے درمیاں الجھے رہے
عمر بھر ہم لوگ بھی آز ؔر کہاں الجھے رہے

اک ہمیں تھے حضرتِ حاتم کے رشتہ دار کیا
زندگی بھر امتحاں در امتحاں الجھے رہے

اس نے رکھا تھا چھپا کر نکتۂ حسنِ عروج
اور ہم بھی داستاں در داستاں الجھے رہے

ہم نے دونوں کے لئے دیں بارہا قربانیاں
اور ہم سے ہی زمین و آسماں الجھے رہے

جاہلوں کے سامنے خاموش تھے بے شک سبھی
بے زبانوں سے مگر اہلِ زباں الجھے رہے

رزق کا اک بے مسلسل سا ذریعہ کیا ملا
اور پھر گھر کے سبھی پیر و جواں الجھے رہے
***

حسابِ روز و شب ہی ماہ و سال کا سبب بنا
وہ ہجر ہی تھا جو ترے وصال کا سبب بنا

وگرنہ میری دشمنی کسی سے بھی کبھی نہ تھی
مرا عروج ہی مرے زوال کا سبب بنا

ہزار زخم دل پہ تھے مگر ترا دیا ہوا
عجیب زخم تھا جو اندمال کا سبب بنا

ہر اک جگہ، ہر ایک ظلم کے خلاف میں ہی میں
اسی لئے سبھی کے اشتعال کا سبب بنا

اسی نے میری زندگی کا رخ بدل کے رکھ دیا
وہ حادثہ جو میرے انتقال کا سبب بنا

وگر نہ ان کی نسل بھی غلام ہوتی آج تک
کوئی تو تھا جو حضرتِ بلال کا سبب بنا

وہ نفرتوں کا دور پھر بلا رہا ہے کس لئے
یہی تو تھا جو پرچمِ ہلال کا سبب بن

وہ کون تھا، کہاں سے آیا تھا، کدھر گیا وہ شخص؟
کوئی تو تھا جو ندرتِ خیال کا سبب بنا

تمام رات گفتگو کا سلسلہ رواں دواں
ہر اک جواب پھر نئے سوال کا سبب بنا
***

غزلیں --- سلیم انصاری

یہ زمیں مٹّی کی ہے یہ آسماں مٹّی کا ہے
سچ تو یہ ہے زندگی کا ہر نشاں مٹّی کا ہے

دشت کو گلزار کرنے میں جنوں سے بھی گئے
اور مجھ پر قرض کتنا مہرباں مٹّی کا ہے

دفن ہیں اس میں مری بچپن کی سب محرومیاں
وہ جو دریا کے کنارے اک مکاں مٹّی کا ہے

منکشف ہوتا نہیں مجھ پر جو رازِ کائنات
ایک پردہ میرے اس کے درمیاں مٹّی کا ہے

اور کیا دوں اپنی مٹّی سے محبت کا ثبوت
میری پیشانی پہ بھی روشن نشاں مٹّی کا ہے

در حقیقت اپنی مٹّی کا ہوں میں مجرم سلیم
پھر بھی میرے واسطے سارا بیاں مٹّی کا ہے
***

یہ دادی اور نانی کھو رہے ہیں
کہ بچّے اب کہانی کھو رہے ہیں

سمندر بیکرانی کھو رہے ہیں
کہ دریا ہی روانی کھو رہے ہیں

تو کیا تہذیب کا ماتم کریں ہم؟
اگر رشتے معانی کھو رہے ہیں

کشادہ تو ہے دستر خوان، اور ہم
شعورِ میزبانی کھو رہے ہیں

جنہیں دل سے بہت ازبر کیا تھا
وہ سب چہرے زبانی کھو رہے ہیں

ہمیں خوابوں کی تعبیریں بہم ہیں
مگر آنکھوں کا پانی کھو رہے ہیں
***

غزلیں --- سید عاطف علی

جو ہم نہ ہوں تو ہے کس کام کی یہ رعنائی
ڈبو کے چھوڑے گا تم کو یہ زعم یکتائی

اگر چہ کہہ تو دیا تم نے جو میں چاہتا تھا
وہ زیر و بم نہ تھے لیکن شریک گویائی

چراغ ڈستے رہے میری تیرہ راتوں کو
سحر نہ بن سکی تریاق زہر تنہائی

جو لفظ قید ہیں تیرے لبوں کی بندش میں
اگر وہ سچ ہیں تو کیوں ہے یہ خوف رسوائی

ادھر میں روح کی جراحیوں میں ہوں مشغول
وہ انجمن میں ادھر محو جلوہ آرائی

تڑپ کے شب دل مضطر سے اک صدا جو اٹھی
وہی شبیہ ستاروں میں بھی ابھر آئی

میں کب کا توڑ چکا شش جہت کی زنجیریں
یہ کس نے میرے لیے، کیسی قید بنوائی

دروغ مصلحت آمیز ہم کو نامنظور
کہ مطمئن ہے جنوں پر ہماری سچائی

کسی طبیب نے اس درد کو نہ پہچانا
یہ کس کے عشق کی عاطف تھی کار فرمائی
***

کوئے بتاں میں تیرا نشاں ڈھونڈتے رہے
ہم لامکاں میں ایک مکاں ڈھونڈتے رہے

مسحور اک طلسم ندیدہ سے عمر بھر
تھامے چراغ تیرا نشاں ڈھونڈتے رہے

زیر زمین گھر کا نہ گزرا ہمیں خیال
ہم زیر آسمان اماں ڈھونڈتے رہے

افسانہ جوئے شیر کا سن کر تڑپ اٹھے
تیشہ بدست کوہ گراں ڈھونڈتے رہے

مستانہ وار جشن بہاراں کو چھوڑ کر
دیوانہ وار فصل خزاں ڈھونڈتے رہے

خاطر میں لائے خار مغیلاں کبھی نہ ہم
گم گشتہ وہ ہی محمل جاں ڈھونڈتے رہے

دریا تھا ساتھ ساتھ مگر تشنگی نہ تھی
صحرا میں آ کے آب رواں ڈھونڈتے رہے

تسلیم شیخ جی کی کرامت ہمیں مگر
بیعت کو دستِ پیر مغاں ڈھونڈتے رہے
***

غزلیں --- محمد صابر

رقص کرتے ہوئے سائے کا سراپا رکھ لے
آدمی سوچ میں رہتا ہے کہ کیا کیا رکھ لے

میں مداری ہوں مرا کام تماشہ کرنا
اس کی مرضی ہے وہ جس وقت تماشہ رکھ لے

چکھ کے باقی کا یہاں پھینک دیا ہے میں نے
جس نے رکھنا ہے بڑے شوق سے دریا رکھ لے

اس میں کچھ لوگ بچا رکھے ہیں اس سے کہنا
دل مرا چھوڑ کے بندے کا بقایا رکھ لے

میں نے ویسے بھی محبت میں فنا ہونا ہے
میں تو کہتا ہوں کہ مجھ کو مری لیلی رکھ لے

خط ہیں اس پوٹلی میں پیار کی کچھ یادیں ہیں
کام آئیں گی اکیلے میں یہ اشیا رکھ لے

میں جسے ہاتھ لگاتا ہوں بنا دیتا ہوں
لے مرے ہاتھ سے نکلی ہوئی دنیا رکھ لے

نیند کو مار بھگا ہجر میں چوکنا ہو
جاگنے کیلئے تو آنکھ میں کانٹا رکھ لے

علم کو پیٹ کی مجبوریوں سے اونچا رکھ
یا خدا دیس کے بچوں کا تو بستہ رکھ لے

دسترس میں میں ہمیشہ کے لیے آیا ہوں
اب جہاں جیس بھی رکھنا ہے تو ویسا رکھ لے

شعر کہتا ہوں کہ کچھ دیر رہوں باقی میں
درد لکھتا ہوں کہ کچھ یاد زمانہ رکھ لے

یہ الگ بات کہ ردی میں کہیں دب جائیں
یہ الگ بات کہ عرضی کو مسیحا رکھ لے

اب تو یوں ہو کہ میں تقسیم ہو کے رہ جاؤں
بد دعا دے کہ مجھے زندگی آدھا رکھ لے

وہ اشارے سے بتاتا ہے کہ دل رکھنا ہے
پھر وہ چٹکی سی بناتا ہے کہ اتنا رکھ لے
***

آنکھ چلتی ہو تو عریاں نہیں کرتے سر جی
اس طرح گھر کو پریشاں نہیں کرتے سر جی

فائدہ کچھ نہیں ہے انگلیاں اٹھانے کا
چاند سے دست و گریباں نہیں کرتے سر جی

لوگ کہتے ہیں کہ عادت ہے بنا لی اب تو
آپ پینے سے گریزاں نہیں کرتے سر جی

ہر شکایت پہ یہ ماتم تو نہیں ہو سکتا
روز مر مر کے تو حیراں نہیں کرتے سر جی

کشتیاں باندھ کے برہم نہیں کرتے پانی
اس طرح تلخیاں افشاں نہیں کرتے سر جی

بوجھ موسم کا اٹھایا نہیں کرتے سر پر
پیڑ تو دھوپ کا ساماں نہیں کرتے سر جی

چیخ واجب ہے ضروری ہے اگر جینا ہے
صرف کاسے کو نمایاں نہیں کرتے سر جی

نام ور لوگ ہیں سب شہر میں رہنے والے
بات اس شہر کے انساں نہیں کرتے سر جی
***

غزلیں --- جلیل حیدر لاشاری

چوٹ لگی ہے تو جانا ہے
سچی بات بھی افسانہ ہے

ایسے دل کی آس بندھی ہے

اس نے واپس کب آنا ہے !

سب کا ہے جب خاک مقدر
کیا کھونا پھر کیا پانا ہے

ایک نئے انداز میں سب نے
بات پرانی دہرانا ہے

کون ہمیشہ ساتھ رہا ہے ؟
سب نے انت بچھڑ جانا ہے

اُس نے شاید دیکھا نہ ہو
پہروں خود کو سمجھانا ہے

اونچائی کی تہہ تک دیکھو
کتنا گہرا ویرانہ ہے

اتنی بھی کیا جلدی حیدرؔ
تم نے کون سا گھر جانا ہے
***

اپنے لہو سے بزم سجاتا نہ ہو کہیں
میرا وجود قرض چکاتا نہ ہو کہیں

ایسی ہنسی تو اس کے لبوں پر نہ تھی کبھی
خود سے وہ اپنا درد چھپاتا نہ ہو کہیں

بیکار جس کو جان کر تو نے گنوا دیا
منزل کو راستہ وہی جاتا نہ ہو کہیں

تاریکیاں اتر چکی ہوں جس کی روح تک
وہ دن کو بھی چراغ جلاتا نہ ہو کہیں

خود ہی بچھڑ گیا جو زمانے کی بھیڑ میں
تنہائیوں میں مجھ کو بلاتا نہ ہو کہیں
***

ہر گھڑی یوں نہ کج ادائی کر

ٹوٹے دل تک بھی کچھ رسائی کر

کل بھلانا نہ ہو تجھے مشکل
آج تھوڑی سی بے وفائی کر

شوق سے ہم فقیر لوگوں پر
تُو بھی دو چار دن خدائی کر

جس کو چہرہ ترا عیاں کر دے
بات خود سے بھی وہ چھپائی کر

شب جو اتنی طویل ہے یارب
زندگی مختصر بنائی کر
***

غزلیں ... مقبول حسین

جو درس دیتے تھے کوئی نہ پی پلا کے ملے
کسی حسیں کو ملے خود تو لڑکھڑا کے ملے

اسے کہو کہ وُہ مجھ سے بھی مسکرا کے ملے
رقیب کو جو ہمیشہ ہی کھلکھلا کے ملے

وُہ کاش مجھ سے ملے فاصلے مٹا کے سبھی
اگر گلے نہ ملے ہاتھ ہی ملا کے ملے

اکیلے ملنے کا اپنا سرور ہے لیکن
مزہ ہے تب کہ وُہ دشمن کو بھی دِکھا کے ملے

ہم اس کو ملنے گئے اس نے جس جگہ بھی کہا
جہاں تھا جان کو خطرہ وہاں بھی جا کے ملے

وُہ مجھ سے عشق کی پوری نماز کیا پڑھتا
اسے تو میرے لیے فرض بھی قضا کے ملے

سنا ہے گرمیِ جذبات کا وہ منبع ہے
جہاں سے جھونکے مجھے سرد سی ہوا کے ملے

ہماری پیٹھ میں کس نے چھُرا یہ گھونپ دیا
کہ ہم تو دوستوں کو تھے گلے لگا کے ملے

وہی تو لفظ ہیں مقبول میرا سرمایہ
جو مجھ کو اس سے ،بچھڑتے ہوئے دُعا کے ملے
***

چاہت سے اپنی خود ہی مُکرناپڑا مجھے
اس کے کہے پہ کام یہ کرنا پڑا مجھے

کھو کر ترے خیال میں کر لوں گا وُہ بھی پار
گر پل صراط سے بھی گذرنا پڑا مجھے

بیگانگی، جنون، سزا موت کی فقط
ہرجانہ بس یہ پیار کا بھرنا پڑا مجھے

ناسور بن رہا تھا جدائی کا تیری زخم
یادوں کا ناخن آج کترنا پڑا مجھے

خواہش تو میری یہ تھی کہ مل جائے عُمرِ خضر
دیکھا مگر جب اس کو تو مرنا پڑا مجھے

آئیں سمجھ میں زیست کی ساری حقیقتیں
جب گہرے پانیوں میں اترنا پڑا مجھے

اتنا تھا کربناک مرے ٹوٹنے کا شور
پتے گرے ہوا سے تو ڈرنا پڑا مجھے

میں تھا سُبُک خِرام مگر زندگی میں کچھ
آئے مقام ایسے، ٹھہرنا پڑا مجھے

خوشبو نہ ہو تو پھول کا، مقبولؔ کیا وجود!
خوشبو گئی تو ساتھ بکھرنا پڑا مجھے
***

نیا نگر --- تصنیف حیدر
قسط ۴

تاریکی ابھی ڈھلی نہیں تھی، جھٹپٹا ہی تھا۔ مجید صاحب گھر پر بیٹھے معقول نقوی سے کسی معاملے پر سنجیدہ گفتگو کر رہے

تھے کہ اتنے میں مرزا امانت ایک شخص کو اپنے ساتھ لے کر حاضر ہوا۔ ڈرائنگ روم میں کچھ دوسرے شاگرد بھی بیٹھے تھے جو آپس میں چپکے چپکے مگر بڑے جوشیلے انداز میں بات چیت کر رہے تھے۔ دروازہ کھلنے پر پڑوس سے ایک جھلملاتے ہوئے فلمی نغمے کی آواز بھی گھر میں وارد ہوئی، جس پر ایک شاگرد موج میں آ کر چٹکیاں بجانے لگا۔ مرزا امانت نے دروازہ بند کیا اور اپنے ساتھ موجود شخص کو ایک جانب بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ مجید صاحب یعنی اپنے استاد کی جانب آگے بڑھا۔ باری باری ان سے اور معقول نقوی سے ہاتھ ملا کر وہ برابر ہی بیٹھ گیا اور گفتگو کے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ بات کسی شاعر پر ہو رہی تھی، جس کا جوانی میں انتقال ہوا تھا اور جو مجید صاحب کی جوانی کے دنوں میں ان کا اچھا دوست رہ چکا تھا، اس کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا، مگر مجید صاحب نے جب اس کے اشعار معقول نقوی کو سنائے تو وہ پھڑک اٹھا اور نئے سرے سے موت نامی ٹریجڈی پر ایک گفتگو چھیڑ دی تھی۔ شیلے سے کر مجاز تک کا ذکر ان کی گفتگو میں آ چکا تھا، وہ اپنی گفتگو کے انتہائی دلچسپ موڑ پر تھا مگر مرزا امانت پلوتھی مارے شانوں کو ایک خاص انداز میں اچکا رہا تھا، اس کے اس طور سے بے صبری صاف جھلک رہی تھی۔ معقول نقوی یوں تو ان معاملوں میں اتنا معقول آدمی نہیں تھا مگر شاید مرزا امانت کے کندھوں کی حرکت اس کے نفیس مزاج پر ضربیں لگا رہی تھی۔ چنانچہ وہ جلدی میں مجید صاحب سے کوئی بہانہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ مجید صاحب کو اس کی عجلت کا سبب تب سمجھ آیا جب مرزا امانت نے معقول سے بیٹھے رہنے کا اصرار کرنے کے بجائے الوداعی مصافحہ کے لیے کھڑے ہو کر گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ مرزا امانت جس شخص کو اپنے ساتھ لایا تھا، اس کا تعارف یہ تھا کہ وہ پہلے ایک پراپرٹی ڈیلر تھا، مگر اب چھوٹا موٹا سرمایہ لگا کر کوئی سائڈ بزنس بھی شروع کرنا چاہتا تھا۔ ابھی تک اس کا دفتر بھی نہیں تھا اور وہ صرف اپنے تعلقات کی بنیاد پر اس فیلڈ میں کام کر رہا تھا۔ نام تھا وسیم۔ اس کی شکل دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ پراپرٹی ڈیلنگ کے کاموں کے لیے جس قسم کی باریک ہوشیاری درکار ہوتی ہے، وہ کام کرتے اور سمجھتے اس کے ہاؤ بھاؤ میں، زبان و بیان میں شامل ہو گئی تھی۔ وہ میرا روڈ کے مختلف علاقوں میں بائیک پر گھوم گھوم کر سودے طے کراتا تھا۔ چنانچہ بات کرتے وقت اکثر اس کی شہادت کی انگلی میں بائیک کی چابی ناچتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ یہی کر رہا تھا، بیٹھا تھا۔ آس پاس شعر و شاعری کی دھیمی دھیمی گفتگو سن رہا تھا اور ساتھ میں چابی گھماتے ہوئے اس کی نظر امانت کی سرگوشیوں کی جانب ہی تھی۔ امانت کے تعارف کرانے پر مجید صاحب اس سے بہت محبت سے ملتے، جیسے کہ وہ ہر ایک سے ملا کرتے تھے، مگر اب بھی وسیم کی اس ملاقات کا مدعا ان پر روشن نہیں ہوا تھا۔ شاید مرزا امانت اصل بات کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا، چنانچہ وسیم نے ہی تھوڑی بہت رسمی گفتگو کے بعد مدعا صاف لفظوں میں بیان کیا۔ اور پوری بات کا جو مطلب مجید صاحب کو سمجھ میں آیا وہ یہ کہ وسیم نے قاری مستقیم کے یہاں رکھے مجید صاحب کی کتابوں کے کارٹن دیکھے تھے اور میرا روڈ کی شعری و ادبی فضا کو بھانپتے ہوئے اسے لگتا تھا کہ اگر یہاں کوئی چھوٹی موٹی لائبریری قائم کر دی جائے تو لوگ باگ ضرور سستے داموں پر دس پندرہ دن کے لیے ادبی و علمی کتابیں کرایے پر ضرور لیں گے اور تب تو بزنس کے چمکنے کا امکان اور زیادہ ہے اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ یہ کتابیں مجید صاحب کی ہیں۔ اس نے اس مقصد کے لیے ایک دکان بھی دیکھ رکھی تھی اور اگر مجید صاحب راضی ہو جائیں تو وہ دکان کو دو چند روز میں ہی حاصل کر سکتا تھا۔ یہ دکان بالکل سڑک پر تو نہ تھی، مگر بازار کی پچھلی طرف ہوتے ہوئے بھی، ایسا نہ تھا کہ لوگوں کی آوا جاہی وہاں بالکل نہ ہو۔ چنانچہ جیسے ہی مجید صاحب اس بات کے لیے اپنی رضامندی دے دیں گے وہ دکان کرایے پر لے لے گا۔ مجید صاحب اس آفر کے بدلے میں تھوڑا وقت مانگنا چاہتے تھے۔ کتابوں کے تعلق سے وہ پہلے ہی بہت پریشان تھے کہ قاری مستقیم کی دکان میں انہیں کب تک رکھا جا سکے گا۔ وہ مروت میں کچھ کہتا نہیں، لیکن اگر کسی دن اسے اپنا سپیس بڑھانا ہوا تو کیا ان کے پاس کتابوں کو رکھنے کے لیے کوئی دوسرا بندوبست تھا؟ گھر میں ویسے ہی جگہ کم تھی، مگر ہوتی بھی تو کتابوں کے لیے ڈھنگ کی تین چار الماریوں کا بندوبست تو کم سے کم کرنا ہی پڑے گا اور آج کل ایک الماری دو ڈھائی ہزار سے کم تو کیا ہی ملتی ہو گی۔ ٹین کے ریک بھی لیے جائیں تب بھی سات سو روپیہ فی ریک رقم خرچ ہو گی۔ اس حساب سے کم از کم اکیس سے اٹھائیس سو روپیہ صرف ان کی خرید پر آئے گا۔ پھر مزدوروں سے ان کی پہنچوائی، اس کے بعد کتابوں کو ڈھو کر یہاں لانا اور مان لو کہ یہ ساری مصیبتیں جھیل کر اس چھوٹے سے گھر کو کتابوں سے آراستہ کر بھی دیا جائے تو خود اس چھت کا کیا بھروسہ جو تین ماہ کے کرایے کی رقم سے بالکل سروں سے آ لگی تھی اور اگر ایک دو مہینے پیسے اور نہ گئے تو اس کے دھنسنے کا بھی امکان تھا۔ وہ انہی سب خطوط پر غور کر رہے تھے، اندر کے کمرے میں جا کر انہوں نے بیوی سے مشورہ کیا۔ بیوی نے پوچھا

’کیا وہ کچھ ایڈوانس بھی دیں گے؟‘

’ابھی تو کوئی بات نہیں ہوئی۔‘ انہوں نے بیوی کی کنپٹی پر ابھرتی ہوئی نس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

’بات کر کے دیکھیے، اس بار ملک صاحب کو منانا مشکل ہو گا، اگر وہ کچھ دے دے تو کم از کم ایک ماہ کا کرایہ تو ان تک پہنچا دیا جائے۔‘

بیوی کی بات درست تھی۔ مگر پیسوں کے لیے کہنا مجید صاحب کی جان کے لیے ایک الگ ہی مصیبت تھی۔ پھر بھی انہوں نے سوکھتی ہوئی حلق پر گھونسے مارنے کے سے انداز میں جلدی جلدی مرزا امانت کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی پریشانی بیان کر دی۔ وسیم نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

’آپ اس سب کی چنتا نہ کیجیے مجید صاحب۔ ایک بار لائبریری کھل جائے، میں ہفتہ بھر میں کوشش کروں گا کہ آپ کو کچھ ایڈوانس دیا جا سکے۔‘

لائبریری کا جب اتنا ذکر ہوا تو وہاں موجود شاگرد کیسے اس بات سے بے خبر رہ سکتے تھے۔ ان کی آنکھیں چمکنے لگیں اور وہ اپنی گفتگو کو بھول کر میرا روڈ کی سب سے شاندار لائبریری کا تصور کر کے گد گد ہو گئے۔ حالانکہ ان میں سے ایک شخص بھی کتاب کا شوقین نہیں تھا، اور نہ کبھی باقاعدگی سے کسی لائبریری کا کبھی ممبر ہی رہا ہو گا۔ لائبریری کا تصور بھی شاید ان کے لیے مجید صاحب کی شاگردی کے توسط سے ایک نئے اور شاندار چائے گھر کا تصور ہی ہو گا۔ چنانچہ ان کی بانچھیں کھلی جاتی تھیں۔ اگلی دوپہر تک پورا نیا نگر اس بات سے واقف ہو چکا تھا کہ محلے میں مجید صاحب کی کتابوں کی مدد سے ایک نئی لائبریری کھلنے والی ہے۔ اگلی شام بہت سے لوگ آئے اور ان میں سے اکثر خاص لائبریری کی مبارکباد دینے آئے تھے۔ مجید صاحب شرمائے شرمائے سب کی مبارکبادیں قبول کر رہے تھے، ان کے دل میں ایک چھپی ہوئی پریشانی اور آنکھوں میں کچھ رقم ملنے کی امید کو ان کی بیوی کے علاوہ کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اور اس روز جب مہینہ گزرنے میں فقط دو دن باقی تھے۔ لائبریری وجود میں آ چکی تھی۔

***

دنیا کی اس گھن چکر نگری میں دیکھیے تو کون سی ایسی چیز ہے جس پر ہنسا نہیں جا سکتا۔ سائیکل سے گرتا ہوا آدمی ہو، کوئی تھل تھل بدن ہو، جھولے میں بیٹھ کر ڈرتی ہوئی دوشیزہ ہو یا پھر خفیہ امراض کو ٹھیک کرنے کا کوئی اشتہار۔ مگر جو چیز بجائے خود اپنے آپ میں ایک مذاق بن کر رہ جائے وہ عزت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ نیا نگر کا ایک ایک باشندہ اسی عزت کا بھوکا ہے، اس نیا نگر کو اٹھائیے اور دنیا پر رکھ دیجیے۔ سبھی ایک قسم کی ’عزت‘ کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ کچھ عزت پانے کے لیے، کچھ عزت بچانے کے لیے۔ لیکن عزت کا صحیح مفہوم کیا ہے، وہ کب ملتی ہے، کس حد تک انسان کو نفسیاتی طور پر مطمئن کرتی ہے اور کہاں تک اسے مجروح کرتی ہے۔ یہ ساری چیزیں اتنی عجیب ہیں کہ انہیں سمجھنا مشکل ہے۔ نیا نگر جس شاعری کے بل پر رونق آباد بنا ہوا تھا وہ سب اسی عزت کے نپے تلے تصور کے بل پر تھا۔ لوگ نہیں دیکھتے کہ جو عزت دار ہے، وہ اندر سے کتنا شکستہ ہے اور جو بے عزت ہے وہ باہر سے کتنا پر وقار۔ لوگوں کے پاس اتنا وقت بھی نہیں، وہ تو بس ان سب چیزوں کا اندازہ تالیوں، تعریفوں سے ہی لگاتے ہیں کہ کون عزت کے ترازو میں کیسے تولا جا رہا ہے۔ نظر مراد آبادی کی نظر میں عزت کوئی بھاری شے نہیں تھی، وہ اسے ڈھو رہا تھا تو اس لیے تاکہ اس کی جیب کچھ بھاری ہو سکے، اسے ایک مشاعرہ مل سکے، ایک خوشامد پسند استاد کی سرپرستی مل سکے اور ان دونوں کی بدولت اسے کچھ روپیہ پیسہ بھی ہاتھ آ جائے۔ نظیر روحانی چائے کی موٹی موٹی چسکیاں لیتے ہوئے آج کا اخبار بے قراری سے دیکھ رہا تھا، اس کے سر پر ٹوپی تھی، بدن پر ایک بنیان اور نچلے دھڑ پر ایک نیلی رنگ کی تہمد۔ اس کی بے یقینی اور بے قراری اس کی آنکھوں میں نمایاں تھی۔ تھوڑی دیر تک نظر اسے دیکھتا رہا، پھر جب رہا نہ گیا تو پوچھ بیٹھا۔

’کیا ہوا سرکار؟‘

’ارے اس نامعقول عورت نے پھر اپنا بیان بدل دیا ہے۔‘

’کس نے؟‘

’یہی ظہیرہ شیخ۔۔۔ اب اخبار میں اس کا انٹرویو چھپا ہے، کہہ رہی ہے کہ عدالت میں بیان اس لیے بدل دیا کیونکہ جان کو خطرہ تھا۔ عجیب دوغلی عورت ہے، ابے جان تو تیری جاہی چکی تھی اسی دن جب تیرے گھر والے نذر آتش کر دیے گئے، اب کس کے لیے زندہ ہے؟ جھوٹی، مکار۔۔۔ کھا لیے ہوں گے پیسے قاتلوں سے۔۔‘

وہ اسی طرح غصے میں بولتا رہا۔ گجرات میں گزشتہ سال جو دنگے ہوئے، اس کو لے کر مسلمانوں میں ایک عجیب قسم کا غصہ تھا۔ عدالت سے انہیں بہت حد تک امید تھی، بیسٹ بیکری کیس کا معاملہ اسی لیے بہت سنجیدگی سے لیا جاتا تھا کہ اس کی پرائم وٹنس ظہیرہ شیخ، اس کا بھائی اور والدہ تینوں کے ذریعے انصاف ملنے کی امید تھی۔ مگر عدالت میں ظہیرہ نے اپنا بیان بدل دیا تھا۔ بعد میں اس سے جب پوچھا گیا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تو اس نے بتایا کہ اسے دھمکیاں مل رہی تھیں۔ اخبار میں اس کے انٹرویو کے ساتھ ہی ایک مضمون بھی چھپا تھا، جس کا عنوان تھا ’آخر کیوں بدلا ظہیرہ شیخ نے اپنا بیان‘۔ مضمون نگار نے ثابت کیا تھا کہ وہ مظلوم ہے، ڈری ہوئی ہے، اس لیے اس کا بیان بدلنا کوئی غیر فطری بات معلوم نہیں ہوتی۔ مگر لوگ اس زاویے سے چیزوں کو نہیں دیکھتے تھے۔ جن لوگوں کو وڈودرا کی ہنومان ٹیکری پر اس رات آگ لگا کر مارا گیا، وہ سب

اچانک ان کے اعصاب پر طاری ہو گئے تھے۔ جن کے قتل ہوئے، جن بچوں کو چیرا پھاڑا گیا، جن عورتوں کی عصمت دری ہوئی۔ وہ سب کے سب ہندوستانی مسلمانوں کی نفسیات پر ایک عجیب قسم کے مظلوم بھوتوں کی طرح حاوی ہو گئے تھے، ان کی چیخیں اخباروں کی سطروں سے لے کر لوگوں کی گالیوں تک میں سنی جا سکتی تھیں۔ نظیر روحانی اس مضمون نگار سے بھی خفا ہو گیا تھا، جس نے ظہیرہ کا پکش لیا تھا۔ وہ اسے بھی دلال، قاتلوں کا ایجنٹ اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ اس کا غصہ اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ وہ بات کم کر رہا تھا کف زیادہ اڑا رہا تھا۔ چنانچہ نظر نے اس کے غصے کو کم کرنے کے لیے کہا۔
’کہاں آپ ان سب خبروں میں الجھے ہیں، لائیے وہ غزلوں کا رف والا مسودہ کہاں ہے؟ آج بیٹھ کر ساری غزلیں نقل کیے دیتا ہوں اور پھر شام کو حاجی نفیس کے یہاں شعری نشست بھی تو ہے۔ نئی غزل پڑھیں گے یا پرانی۔ پرانی غزلیں اب آپ کی سب سنی جا چکیں، کچھ نیا لکھیے۔‘
سب سنی جا چکیں، ایسا جملہ تھا، جس کے دفاع میں فوراً نظیر روحانی کود پڑا۔ اس نے کہا
’ایسا تو ہرگز نہیں ہے۔ یہ جو رف والا مسودہ ہے، اس کی ایک غزل بھی کہیں میں نے پڑھی نہیں۔ وہ سب تو میں اپنے پرزوں پر جو کچھ لکھتا ہوں، وہی سب پڑھتا رہتا ہوں۔‘
نظر نے بڑے خوشامدانہ انداز میں کہا۔
’استاد! کتنی غزلیں لکھ چکے ہیں اب تک؟‘
’بھئی! خدا غرور سے بچائے۔۔ بس یہ سمجھو نظر میاں کہ تیس سال سے بندہ غزل گوئی کر رہا ہے۔ تلمیحی اشاروں کو رقم کرنے کا کام گزشتہ چھ برسوں سے جاری ہے، اور کوئی دن ایسا نہیں گزرتا، جب میں نے کوئی نئی غزل نہ لکھی ہو۔۔۔‘
’افوہ! اسے کہتے ہیں فنکاری۔۔ کمال ہیں آپ استاد!‘
نظر نے دیکھا، نظیر روحانی اخبار تہہ کر کے ایک طرف رکھ چکا تھا۔ خوشامد اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ اس نے نظیر روحانی کی دو تین غزلیں یاد کر لی تھیں، چنانچہ وہ ایک غزل ترنم میں گنگنانے لگا۔ نظیر روحانی کو اس بات پر ایسی حیرت بھری مسرت ہوئی کہ اس نے خوشی سے دو بار ران تھپتھپائی اور اپنی ہی غزل کو کسی مشہور شاعر کا کلام مان کر انہماک سے سننے لگا۔
***

حاجی نفیس رئیس آدمی تھا۔ میرا روڈ میں دو اور بھائینڈر میں اس کا ایک سی سائڈ فلیٹ تھا۔ کم از کم گیارہ بار حج اور ان گنت بار عمرہ کر چکا تھا۔ شاعری پر کسی سے اصلاح نہیں لیتا تھا کیونکہ وہ خیال کی اوریجنلٹی کا قائل تھا۔ چنانچہ اس کی اکثر غزلیں بے بحر ہوتی تھیں۔ مگر وہ انہیں ایسے لہک لہک کر ترنم اور تحت میں پڑھتا کہ محفل جھوم جھوم جاتی۔ محفل کے جھومنے میں کچھ اس کی امیری اور کچھ اس کے مسخرے پن کا دخل تھا۔ مجید صاحب کی دل سے عزت کرتا تھا اس لیے ہر نشست کی صدارت انہی کے ذمہ ہوتی تھی، وہ بس اتنا خیال کرتے تھے کہ اس کی بے بحر شاعری کو محبت سے مسکرا کر قبول کرتے تھے، اسے روکتے ٹوکتے نہیں تھے، دوسروں کی طرح اس کا مذاق نہیں اڑاتے تھے اور سب سے بڑھ کر اپنی طرف سے اصلاح کی کوشش بھی نہیں کرتے تھے۔ حاجی نفیس کو اپنی بے بحر شاعری پر جو زعم تھا اس کی ایک وجہ تھی اور وہ تھی بھی بڑی دلچسپ۔ کچھ عرصہ پہلے اس کا مجموعہ کلام بھاری قیمت پر میرا روڈ کے ہی ایک پبلشر کے ذریعے شائع ہو کر منظر عام پر آیا تھا۔ لیکن منظر عام پر آنے کے باوجود بھی لوگ اس کی کتاب قبول کرتے ہوئے کتراتے تھے۔ کبھی کوئی بہانہ بناتے، کبھی کوئی۔ چنانچہ بچارے کی اشاعت شدہ ایک ہزار کاپیاں اس کے عالیشان فلیٹ کے ایک کونے میں پڑی رہتی تھیں۔ مگر ایک روز جب قاری مستقیم کی دکان پر بہت سے شاعروں کی بیٹھک جمی ہوئی تھی۔ وہ ایک سفید رنگ کا بڑا سا لفافہ لہراتے ہوئے بیٹھک میں جا گھسا۔ اور سب کے سامنے وہ سفید لفافہ لہراتے ہوئے گویا ہوا۔
’آپ لوگ میری شاعری کو گھاس نہیں ڈالتے۔ میں جانتا ہوں کیوں، کیونکہ آپ کے بقول یہ بحر میں نہیں ہے۔۔ تو حضرات بحر کا زمانہ جا رہا ہے، یہ تو خیال کی چمک کا زمانہ ہے، میں نہ کہتا تھا کہ اس کی صحیح قدر عالمی سطح پر ہی ہو سکتی ہے۔۔ جب کہتا تھا تو یار دوست ہنستے تھے۔۔۔ مگر یہ دیکھیے، ثبوت۔۔ بل کلنٹن کے دفتر یعنی وہائٹ ہاؤس سے مجھے خط آیا ہے۔ اور کیا لکھا ہے، پڑھ کر سنا دیتا ہوں۔۔۔ ۔ اردو میں ہی لکھا ہے، عزت مآب حاجی نفیس صاحب۔۔۔‘ اور اس نے ایک سانس میں اس تہنیت نامے کو پڑھ کر ایسے سنایا، جیسے وہ دنیا کا پہلا شاعر ہو، جسے چچا سام کی سند حاصل ہوئی ہو۔ خیر دنیا کا نہ سہی، اردو کا تو وہ واقعی پہلا شاعر تھا، جسے وہائٹ ہاؤس سے کتاب کی موصولی کی ہی سہی، مگر ایک حوصلہ افزا چٹھی ملی تھی۔ اس طرح ببانگ دہل خط سنانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ پہلے اس پر ہنستے تھے، وہ اب اس واقعے پر ہنسنے لگے۔ مگر چند بزرگوں نے جن میں مجید صاحب اور یوسف جمالی دونوں شامل تھے۔ اس کی بڑی دلجوئی کی، اس سے کہا کہ واقعی اس کی قدر اس زمانے اور اس علاقے میں نہیں، ورنہ وہ بہت اچھا شاعر ہے اور زمانے کی قدر نا شناسی سے ڈرنا ٹھیک بات نہیں کہ یہ تو غالب کے حصے میں بھی نہیں آئی تھی۔ میر کو بھی اہل لکھنؤ نے تب تک ہنسی میں اڑایا، جب تک ان کو ٹھیک

سے پہچان نہ لیا، چنانچہ اسے مایوس ہونے کی نہیں، بس انتظار کی ضرورت ہے۔ وہ وقت آیا ہی چاہتا ہے، جب نیا نگر سے اس کے نام کا جو غلغلہ بلند ہو گا، وہ وایا امریکا پوری دنیائے ادب میں اپنی دھاک بٹھا دے گا۔ اسی حوصلے پر آج اس نے یہ نشست رکھی تھی، جس میں کھانے کا عمدہ انتظام تھا، مگر نشست کی واحد شرط اتنی تھی کہ جو مہمان آج آئیں گے انہیں نہ صرف حاجی نفیس کی کتاب لینی ہو گی بلکہ اس کے ہی مکان پر اگلی نشست میں اس پر اپنی رائے کا اظہار بھی کرنا ہو گا، جس سے یہ پتہ چل سکے کہ انہیں کتاب پڑھ کر کیا محسوس ہوا۔ اسے یقین تھا کہ لوگ اس کی شاعری کو ایک دفعہ اگر ٹھیک سے پڑھ لیں تو ضرور اس کے قائل ہو جائیں گے۔ چنانچہ رونق لگی تھی۔ رونق کی دو وجہیں تھیں، پہلی وجہ تھی عمدہ کھانوں کی وہ فہرست جن کا ذکر دعوت ناموں سے لے کر پوسٹروں تک میں کیا گیا تھا اور دوسری وجہ تھی مجید صاحب کے بلانے پر فدا فاضلی جیسے مشہور شاعر کی آمد۔ پروگرام میں جن شعرا کو پڑھنا تھا ان کی تعداد بہت لیے دیے رہنے کے باوجود تیس بتیس تک پہنچ چکی تھی، کیونکہ ہر شخص اپنی شاعری کے جوہر فدا فاضلی جیسے مشہور شاعر کو دکھانا چاہتا تھا، اس لیے لازمی احتیاط کے باوجود بھی یہ فہرست طویل تر ہوتی گئی، اور کاغذ پر فائنل فہرست کے علاوہ بھی مزید چار پانچ لوگوں نے پڑھ کر ہی دم لیا۔ نشست میں نسیم بریلوی بھی آئی تھی، وہ آئی تھی تو شہناز بھی آئی تھی اور شہناز آئی تھی اس لیے اس پروگرام میں بڑے بھائی سے ایک غزل ادھار مانگ کر تنویر صاحب بھی اس نشست گاہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ طے یہ ہوا تھا کہ پروگرام تنویر سے شروع ہو گا اور پھر نجیب اپنا کلام سنائے گا۔ چنانچہ جب نشست کا آغاز ہوا تو تنویر کی غزل اسی طرح سنی گئی، جس طرح پہلی غزل سنی جاتی ہے، اسی کے بیچ میں کندھوں پر سے پھلانگتے ہوئے لوگ کسی دوست کے اشارے پر برابر بیٹھنے کے لیے لپک رہے ہوتے ہیں، گھر کا کوئی فرد پانی پروس رہا ہوتا ہے، زیادہ دھیان دیے بغیر شاعر کا دل رکھنے کے لیے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بھی لوگ واہ واہ کی صدا بلند کر رہے ہوتے ہیں۔ اتنا سب ہو رہا تھا مگر ہر شعر پر تنویر مصنوعی داد پا کر بھی کپکپاتی نظر سے شہناز کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ اس کے بعد نجیب نے (جو کہ اس نشست کی نظامت بھی کر رہا تھا) اپنا کلام پڑھنا چاہا تو لوگوں نے منع کر دیا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ محفل میں اس کے کچھ خوشامدی شاگرد بھی موجود تھے، جو اب مجید صاحب کی جگہ اس سے اصلاح لیتے تھے، شور بڑھا اور یہی طے ہوا کہ نجیب کو اپنے مقام پر ہی غزل سنانا چاہیے۔ نجیب نے اپنی عزت افزائی پر دل ہی دل میں ایک فخر سا محسوس کیا۔ اسے لگا جیسے آج تو یقینی طور پر شہناز کو بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ وہ کتنا عزت دار اور کتنا ہونہار اور قابل شاعر ہے۔ اس نے آج پڑھنے کے لیے جس غزل کا انتخاب کیا تھا، اس میں بھی اظہار محبت کے بہت سے اشارے موجود تھے۔ غالباً شہناز ہی اس بات سے بے خبر تھی کہ نشست ہو یا مشاعرہ، ان کی تہذیب میں پہلے دوسرے مقام پر پڑھنے والے شاعروں کو نوخیز سمجھا جاتا ہے، کسی شاعر کے ادبی و علمی قد کا اندازہ نشستوں میں اسی بات سے لگایا جاتا ہے کہ وہ کون سے مقام پر پڑھ رہا ہے، جیسے کہ اس پروگرام میں بالکل آخر میں فدا فاضلی کو اپنا کلام سنانا تھا۔ اس لیے جتنا بڑا شاعر، اتنا آخر میں اس کا نمبر۔ پھر بھی نجیب کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں اور اس کی امید کو آج کی اس قدر افزائی نے اور بڑھا دیا تھا۔ سب ہی لوگوں نے باری باری کلام سنایا، جن میں نظر مرادآبادی، طائر امروہوی، نسیم بریلوی، امانت مرزا اور قاری مستقیم سبھی تھے۔ نظیر روحانی کا نمبر بھی آخر کے شاعروں میں تھا، لیکن حاجی نفیس سے پہلے کیونکہ حاجی نفیس میزبان تھا اور یہی وہ اکلوتی جگہ ہو سکتی تھی جہاں وہ یوسف جمالی اور مجید صاحب سے پہلے کلام سنا کر خود کو ان کا ہم پایہ شاعر منوا سکتا تھا۔ یہ درجہ بندی دیکھنے میں متعصبانہ لگ سکتی ہے، مگر اسی میں اپنا نمبر استاد کے قریب سے قریب تر لانے کی جستجو ہر شاعر کو رہتی تھی، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہر نئے شاعر کو ہوا کرتی تھی۔ طائر امروہوی کا نمبر آیا تو اس نے باقاعدگی سے کھڑے ہو کر پہلے سب کو آداب کیا، پھر دونوں ہاتھ بدن پر یوں باندھے جیسے نماز کے دوران باندھے جاتے ہیں، پھر فدا فاضلی کی نذر کرتے ہوئے ایک نظم پڑھنی شروع کی، مگر ابھی دو مصرعے ہی پڑھے تھے کہ حاجی نفیس کا چھوٹا بھائی نہ جانے کہاں سے اچک کر نشست میں دھم سے کود پڑا اور زور زور سے حاجی نفیس کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

'کفریات، کفریات۔۔۔ یہ کیسی کفریات بک رہے ہیں، یہ شاعر۔۔۔ اسی لیے اللہ نے ان سب کو جہنم کا ایندھن بنا دیا ہے، کیا ہو گیا ہے بھائی جان آپ کو۔۔ دکھتا نہیں۔۔۔ اپنی آخرت تو خراب کر رہے ہیں، اپنے بچوں کی بھی، بھابھی کی بھی، سب کو لے ڈوبنا چاہتے ہیں کیا۔۔۔ ایسے ایسے با ریش لوگ بیٹھے ہیں یہاں۔۔۔ سمجھ نہیں مگر ان کو اسلام کی۔۔ ارے بھائیوں جاؤ کہیں اور جا کر اپنی عاقبت خراب کرو۔۔۔ اسے شیطان کا گڑھ مت بناؤ۔۔۔' اس کی کچی داڑھی برابر لرز رہی تھی۔۔۔ شاعروں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔۔۔ سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ حاجی نفیس سر نیچا کیے، چپ چاپ اپنے چھوٹے بھائی سے صلواتیں سن رہا تھا۔ دیوبندی مکتبہ فکر کا یہ نیا نیا عالم اس قدر ترش روئی سے شاعروں کو ڈانٹ رہا تھا گویا وہ شعر ہی نہیں سنا رہے ہوں بلکہ ساتھ ساتھ شراب بھی پی رہے ہوں۔ طائر امروہوی سب سے پہلے کھسکا، پھر سارے شاعر مجید صاحب کی پیروی کرتے ہوئے گھر سے باہر جانے لگے، کوئی بچی ہاتھ میں چائے کی بڑی سی ٹرے پکڑے شاید اس طرف لا رہی تھی، مگر اپنے چچا کی گرج دار آواز سن کر گیلری میں کھڑی رہ گئی تھی۔

رات کا قریب گیارہ ساڑھے گیارہ بجا تھا۔ نیا نگر کی سڑکوں پر کتے اچھل کود مچا رہے تھے۔ لمبی سڑک پر اکا دکا گاڑیاں تھیں۔ ماحول میں خنکی تھی مگر شاعروں کی رفتار دھیمی سے بھی کچھ کم تھی۔
’بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے۔‘ فدا صاحب نے غالب کا مصرع پڑھا اور جواب میں مجید صاحب نے استغراق میں ڈوبی ہوئی گردن ہلا دی۔ اب ان دونوں کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ چوک پر ایک ہی ریستوراں کھلا تھا، جس پر سب لوگ جا بیٹھے، جنہیں اندر جگہ نہ ملی وہ باہر بینچیں پھیلا کر براجمان ہو گئے۔ سامنے کھڑی لق و دق مسجد کے دروازے کھلے ہوئے تھے، اور اس کے شکم سے ملگجی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ چند عبادت گزار بوڑھے مسجد سے وقفے وقفے سے نکلتے دکھائی دے جاتے تھے۔ تھوڑی دیر میں سب کے ہاتھ میں شیشے کے گلاس تھے، جن کے شفاف بدن میں چائے کی گرمیاں ڈول رہی تھیں اور ہلکا سفید دھواں اڑ کر باہر کے منظر میں معدوم ہوتا جا رہا تھا۔ طائر امروہوی، فدا صاحب کے پیچھے پیچھے تھا، اسے بے عزت ہونے سے زیادہ اپنی نظم کے ادھورے رہنے کا افسوس تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ نظم کسی صورت پوری ہو جائے، مگر وہ سرا نہیں مل رہا تھا جسے پکڑ کر اپنی تک بندی کا آغاز کیا جا سکے۔ مجید صاحب اب حاجی نفیس کے بھائی کے بارے میں بات کر رہے تھے، وہ خود بھی اچھے موڈ میں تھے۔
’میر صاحب کا شعر یاد آتا ہے
شیطنت سے نہیں ہے خالی شیخ
اس کی پیدائش احتلام سے ہے۔۔۔‘
فدا صاحب نے جواب میں جملہ کسا۔۔ ’آہاہا۔۔ یار کیا شعر ہے، ناصر اور فراق کے انتخاب کو مات دے دی تم نے۔۔ بالکل بروقت۔۔‘
مجید صاحب اس تعریف پر حاجی نفیس کو بھول کر شعر کی پرت کھولنے میں لگ گئے۔
’اب یہ پیدائش کا لفظ جو ہے یہاں پر۔۔ یہ وہ جنم لینے کے معنی میں نہیں ہے۔۔۔ یہ دیکھو کہ پیدائش کا ایک مطلب ہے عیاں ہونا، یعنی شیخ کو ہر روز احتلام ہوتا ہے، اس لیے یہ اس کی شیطنت کی سب سے بڑی مثال ہے۔۔ ایسا ایہام گو ہے میر۔۔ لفظ باریک باندھا ہے، یعنی مطلب بھی گہرا، مگر کوئی اس تک نہ بھی پہنچے تو اپنے طور پر مطلب نکالنے میں آزاد۔۔‘
فدا نے لقمہ دیا
’شیطنت کا کمال ہے۔۔ ایک تو ایسا اچھوتا لفظ، دوسرے یہ کہ رعایتیں دیکھو۔۔ شیخ اسی طرح شیطنت سے بھرا ہوا ہے، جس طرح منی سے عضو تناسل۔۔ لیکن جس طرح احتلام کی صورت منی باہر آ ہی جاتی ہے، شیخ کی شیطنت بھی چھپائے سے نہیں چھپ سکتی۔۔۔ بھری ہی اتنی ہے اس میں۔۔ واہ وا۔‘
پھر ذرا توقف کے بعد فرمایا۔
’اور یہ بھی ہے کہ یہ سالا احتلام کی پیدائش ہے۔۔ یعنی زبردستی کی۔۔‘ انہوں نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ جواب میں محفل میں سبھی لوگوں میں ہنسی کی لہر دوڑ گئی۔
’بھئی۔۔ میر کی رعایت لفظی کو ماننا پڑتا ہے۔۔ گالی بھی دے گا تو رعایت کا خیال رکھے گا۔۔ وہ شعر ہے ایک ہجو میں اس کا جس میں گالی دی ہے ماں کی اس نے؟‘
’کیا؟ خدائے سخن اور ماں کی گالی۔۔ توبہ توبہ؟‘ نظیر روحانی نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگایا۔
’امم ہمم۔۔۔‘ فدا تب تک پان کھا چکے تھے۔۔ مگر بھرے ہوئے منہ کے ساتھ ہی انہوں نے شعر پڑھا۔
’میری ہیبت سے نکل جاتا تھا موت۔۔ شاعری کی ان نے اپنی ماں کی چوت۔۔‘
’ہاں۔۔ ہاں۔۔ یہی یہی شعر۔۔ اب دیکھو‘ مجید صاحب نے نظیر روحانی کی توبہ استغفار پر کوئی دھیان نہ دیتے ہوئے کہا۔۔۔
’ماں کی گالی دی ہے تو دھیان رکھا ہے کہ اسے اتنا چھوٹا لونڈا کہا جائے جس کا کسی کی ہیبت سے موت نکل جاتا ہے۔۔ یہی تو زبان کی سمجھ ہے۔۔ باریکی ہے۔‘
باتیں دلچسپ چل رہی تھیں۔ نجیب نے مڑ کر دیکھا، تنویر کہیں نہیں تھا اور ساتھ ہی نسیم اور شہناز بھی دکھائی نہیں پڑ رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر باہر کی طرف آیا، بینچوں پر بھی جو لوگ بیٹھے تھے، ان میں وہ تینوں موجود نہیں تھے۔ ’شاید انہیں گھر چھوڑنے گیا ہو گا، رات بھی اتنی ہو گئی ہے۔۔‘ وہ واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔۔ کتنا کچھ سیکھنے، سننے کو مل رہا تھا۔۔ مزہ آ رہا تھا۔۔ وہ پڑھتا تھا، مگر کتنی باتوں سے انجان تھا۔
’لیکن ایک بات میں سمجھنا چاہتا ہوں۔۔‘ نظیر روحانی بیچ میں ہی بول پڑا تھا۔
’جی، جی۔۔ فرمائیے۔۔‘ مجید صاحب نے کہا۔
’ادب کا تعلق آداب سے ہے نا۔۔ یہ کیسی بات ہوئی کہ گالیاں دے کر، گندی اور فحش باتیں کیے بنا ہم ادیب ہی نہیں ہو سکتے۔ یہ تو ایک غیر ضروری سی شرط ہے میرے خیال میں۔۔ اسے ہوا دینا کیا ٹھیک ہو گا؟‘ بولتے وقت اس کے کانوں کی لویں سرخ ہو

گئی تھیں۔
تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر فدا فاضلی نے کہنا شروع کیا۔ ’ان صاحب کی بات پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔۔۔ داغ اور امیر مینائی دونوں ہی ہم عصر تھے، شاعری کرتے تھے۔ اب امیر مینائی تھے متشرع آدمی۔ ایک محفل میں انہوں نے داغ کے پاس جا کر سرگوشی کی۔ قبلہ! شعر آپ بھی کہتے ہیں، میں بھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جتنی داد آپ لوٹتے ہیں، مجھے نہیں ملتی۔ جواب میں داغ مسکرائے اور فرمایا۔۔۔ مینائی صاحب۔۔۔ کیا کبھی آپ نے شام کے وقت پیالے کو لبوں سے لگایا ہے؟ امیر مینائی نے کہا۔۔ کبھی نہیں، داغ نے پھر پوچھا، کبھی دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں؟ امیر مینائی نے کہا، حق پرست ہوں حضور۔۔۔ داغ نے پھر پوچھا، رات کے کسی پہر کسی حسینہ کی انگڑائی ٹوٹتی دیکھی ہے؟ اب کی بار امیر مینائی نے شرم سے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔۔۔ استغفر اللہ۔۔۔ جواب میں داغ مسکرائے اور کہا اب بھی آپ کو سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے کیوں زیادہ داد ملتی ہے؟‘
نظیر روحانی کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر مجید صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا اٹھنا تھا کہ محفل کو برخاست ہوتے دیر نہیں لگی۔
***

لائبریری کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ اب مجید صاحب کے گھر کے بجائے دن کی بیٹھکیں وہیں ہونے لگیں۔ وسیم کو ابتدا میں اس ماحول سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی بلکہ اسے خوشی ہی ہوتی تھی۔ کاروبار کا تو اصول ہے کہ جتنے لوگ آئیں گے، اتنا ہی پروموشن ہو گا۔ چنانچہ وہ خوشی خوشی شروعات میں سبھی نئے آنے والے مہمانوں کی آؤ بھگت کرنے لگا، چائے بسکٹ، سموسے، بھجیے سے ان کی خاطر تواضع بھی ہوتی رہتی۔ ہر آنے والا لائبریری میں سجی ہوئی کتابوں کو بڑے غور سے دیکھتا، کچھ لوگ تو اٹھ کر کتابیں نکالتے، جھاڑ پونچھ کر ہر کتاب کو الٹتے پلٹتے، کچھ زیادہ ہی شوقین افراد وہیں کسی کتاب یا رسالے کی ورق گردانی کرتے ہوئے کسی غزل یا شاعری کے متعلق مضمون کو پڑھنا بھی شروع کر دیتے۔ مگر ان میں سے زیادہ تر ایسے تھے، جن کو کتابوں یا رسالوں سے اتنی ہی نسبت تھی کہ وہ ان کے درمیان بیٹھ کر خود کو پڑھا لکھا محسوس کرتے تھے۔ نفاست سے باتیں ہو رہی ہیں، ایک دری بچھی ہے، دو دیواروں پر صوفہ اور کرسیاں سجے ہوئے ہیں۔ شٹر کھلتے ہی سامنے کی دیوار پر چار خوبصورت الماریاں قرینے سے سجائی گئی ہیں اور ان میں علم و ادب کی اہم اور غیر اہم کتابیں سائز کے حساب سے ترتیب وار لگائی گئی ہیں۔ ایک الماری پر فارسی کے شاعر صائب کا دیوان دو جلدوں میں رکھا ہوا ہے، جس کے پہلے صفحے پر مجروح صاحب کے دستخط ہیں اور ساتھ ہی مجید صاحب کے لیے لکھا ہے، حق بہ حقدار رسید۔۔۔
کتابیں ہیں، لوگ ہیں، چہل پہل ہے، مباحثہ ہے۔۔۔ دیکھنے میں یہ سماں ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے ہمیشہ سے سب کچھ یوں ہی تھا۔ مگر وسیم ہی جانتا تھا کہ اس نے دو ماہ پہلے ہی یہ دکان بڑی خاموشی سے کرایے پر لے لی تھی۔ اصول کے مطابق اس کا گیارہ مہینے کا پیشگی کرایہ بمع ڈپوزٹ بھی ادا کر دیا تھا۔ جب مجید صاحب سے کتابوں کو یہاں لا کر لائبریری کھولنے کی اجازت مل گئی تھی تو اس نے کس طرح مضافات کے ایک بازار جا کر وہ چار پرانی مرمت زدہ الماریاں اٹھوالی تھیں۔ انہیں مزدوروں کے ذریعے یہاں لانے اور دکان میں پینٹ وینٹ، صفائی، ستھرائی کا خرچ ملا کر ابھی تک کافی رقم اڑ چکی تھی۔ کتابیں اٹھوانا، ان کو سلیقے سے الماریوں میں سجانا۔ یہ مرحلہ تو ابھی باقی تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ مزید رقم خرچ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسی ادھیڑ بن میں وہ ایک دن قاری مستقیم کی بیوی کے پاس بیٹھا اپنے کچھ دستاویزات تیار کروارہا تھا کہ انہوں نے نئی دکان کا ذکر چھیڑ دیا۔ وسیم نے انہیں پوری صورت حال بتائی تو انہوں نے خاصا گمبھیر چہرہ بناتے ہوئے سوال داغا۔ ’یہ کتابیں اگر مجید صاحب کی نگرانی میں ان کے ہی بیٹوں کے ذریعے دکان میں منتقل کروا کر سٹ کروا دی جائیں تو کیا مناسب نہیں ہو گا؟‘
وسیم اس تجویز پر اتنا خوش ہوا کہ اس نے ہاتھ میں گھماتی ہوئی چابی کے دائرے کو ہوا میں ہی روک دیا اور چھلا کھٹ سے اس کی انگلی کے آخری سرے پر کٹی ہوئی بھیڑ کی گردن کی طرح جھول گیا۔ اب اسے راستہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے مجید صاحب کے آگے کچھ اس طرح بڑے چاپلوسانہ انداز میں یہ درخواست رکھی اور ان کے بیٹوں کو بھی باپ کے علمی بوجھ کو اٹھانے کی اخلاقی ذمہ داری کا ایسا احساس دلایا کہ تینوں بھائی اس چھوٹی سی حمالی پر راضی ہو گئے۔ مگر دو دن بعد جب اس حمالی کے فرض کو عمل میں لانا تھا، نجیب کے علاوہ کوئی اور بھائی میسر نہ آیا، چنانچہ اسی کو بائیک پر بٹھا کر وسیم قاری مستقیم کی دکان پر لے گیا۔ بڑے بڑے نیلے کارٹنوں کو سٹلیوں کی مدد سے باندھا گیا تھا۔ قاری مستقیم کے یہاں پڑے پڑے ان پر دھول بھی جم گئی تھی، چنانچہ پہلے ایک جھاڑن کی مدد سے اوپری کارٹن کی صفائی کی گئی۔ کارٹن کو دیکھنے سے ہی پتہ چلتا تھا کہ اس کا وزن کم از کم بیس سے تیس کلو گرام ہو گا، بلکہ دو ایک کارٹن تو پچاس سے ساٹھ کلو کے بھی تھے۔ قاری مستقیم کی دکان سے نئی نویلی لائبریری کا راستہ قریب یہی کوئی بارہ پندرہ فرلانگ کا تھا۔ نجیب نے پہلے کارٹن کو دیکھ کر ایک لمبی سانس خارج کی اور وسیم کی مدد سے اس کتابی گٹھر کو اٹھا کر اس کی پیٹھ پر رکھ دیا گیا۔ لاغر نجیب کی ٹانگیں بوجھ کی دھمک سے پہلے تو ڈگمگائیں پھر کسی ضدی احتجاج کار کی طرح زمین میں دھنس سی گئیں۔ اس وقت وہ ایک ہلکا پیلا

ٹی شرٹ اور گلابی مائل نیکر پہنے ہوئے تھا، جس میں سے اس کی کالی ٹانگیں لکڑی کی وارنش زدہ پھلیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ پہلا قدم دوسرا قدم بڑھاتے ہی وہ کچھ ڈگمگایا تو پیچھے سے وسیم نے سہارے کی ہتھیلی بڑھا کر کارٹن پر ٹیک دی۔ دکان کی دہلیز پار کر کے پچھلی جانب سے، ریل پٹریوں کے برابر نجیب دھیمے دھیمے قدم بڑھاتا ہوا کسی خمیدہ کمر، عمر دراز بوڑھے کی مانند چل رہا تھا۔ بوجھ نے اس کی پیٹھ پر اس قدر قبضہ جمایا ہوا تھا کہ وہ رکوع کی حالت میں آ چکا تھا۔ پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد ماتھے پر پسینے کی چمک نمایاں ہو گئی تھی اور آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ برابر سے دھڑ دھڑ کرتی ہوئی ایک ٹرین بہت دھیمی رفتار میں گزر رہی تھی، نجیب ٹرین کو نہیں دیکھ رہا تھا مگر بمبئی کی اس لوکل کی نارنگی، پیلی دھاریاں اس کی آنکھوں کے یادداشت کے جزیرے پر ابھر آئی تھیں، اسے لگ رہا تھا کہ ٹرین ڈرائیور نے رفتار جان بوجھ کر دھیمی کر دی ہے تاکہ وہ ایک پتلے دبلے لڑکے کو، پیٹھ پر بھاری بوجھ اٹھائے دھیمے دھیمے چلتے ہوئے دیکھ کر لطف لے سکے اور جان سکے کہ یہ لڑکا اپنی منزل پر پہنچ بھی پائے گا یا اس سے پہلے ہی اس کی آنکھوں کے آگے ایک اندھیرا چمک کر اسے بوجھ کی اس بھاری نیلی عفریت کے نیچے کچل دے گا۔ نجیب کو لگا کہ یہ تماشہ صرف ٹرین ڈرائیور نہیں بلکہ لوکل کے کھلے ہوئے دروازوں پر لٹکے نوجوان، ساریوں میں ملبوس مراٹھی عورتیں اور کھڑکی سے چپکے بیٹھے بوڑھے، بچے سبھی شوق سے دیکھ رہے ہیں۔ ٹرین سست رفتاری اور سانپ جیسے لمبے بدن کے باوجود رینگتی ہوئی اس سے آگے نکل گئی اور وہ اپنی کمر پر کتابوں، کارٹن کی دفتیوں اور نیلی پنی کے ساتھ ساتھ وسیم کی سہارے کے لیے ٹکائی ہوئی ہتھیلی تک کا بوجھ الگ الگ اور بالکل صاف پہچان رہا تھا۔ فاصلہ پورا ہونے والا تھا۔ سات آٹھ قدم کی دوری رہ گئی تھی کہ وہ ایک دفعہ پھر لڑکھڑا کر سنبھلا اور دکان کے پاس پہنچ کر چبوترے پر کارٹن اتارنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ وسیم کی آواز گویا ندائے غیبی کی طرح کانوں میں گونجی۔

'اوٹے پر چڑھاؤ، چڑھاؤ اوٹے پر۔۔ شاباش!'

اور اس نے ایک گہری سانس کھینچ کر زمین میں دھنسے ہوئے اپنے قدم کو بمشکل ہوا میں اتنا بلند کیا کہ وہ چبوترے پر جمایا جا سکے۔ دوسرا قدم بڑھاتے وقت اسے پورا یقین تھا کہ وہ اس بوجھ کو لے کر دھڑام سے نیچے گر پڑے گا، مگر تب تک وسیم نے اپنا دوسرا ہاتھ بھی کارٹن کی پشت سے ٹکایا اور ہلکا سا دھکا لگایا۔ نجیب کو لگا جیسے کوئی اس کے ہلکے پھلکے وجود کو دھکیل کر ایک خلائی ٹرین میں سوار کر رہا ہو۔ دکان میں داخل ہوتے ہی اس نے دھڑ سے اپنی پیٹھ پر لدے ہوئے بوجھ کو زمین پر یوں پھینکا گویا اس عذاب سے اگر چھٹکارا نہیں پایا تو پران سدھار ہی جائیں گے۔ کارٹن زمین پر گرا اور دھول کا ایک مرغولہ اٹھا، وسیم کے کھانسنے کی آواز آئی۔ نجیب نے دکان میں رکھی ہوئی پلاسٹک کی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بس اتنا دیکھا کہ وسیم مٹھی منہ کے آگے جمائے کھوں کھوں کرتے ہوئے سڑک کی طرف جا رہا تھا۔ قریب تین، ساڑھے تین گھنٹوں کی طویل مشقت اور دس بارہ منٹ کے چند چھوٹے چھوٹے وقفوں سے گزر کر نجیب کو اس محنت سے چھٹکارا ملا۔ جب وہ آخری کارٹن رکھ کر دکان سے باہر نکلا تو اس کی حلق دھول اور پسینے کی گندھ سے کڑوی ہوئی جا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کسی نے اسے دونوں ہاتھوں سے نچوڑ کر اس لائبریری کے چبوترے پر پٹخ دیا ہے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہی اتنا سارا وزن ڈھوکر یہاں تک لایا تھا۔۔ وہ جو کہ اپنی دانست میں ایک نفاست پسند، عاشق مزاج، عروض داں اور اپنے وقت کا ایک عظیم شاعر تھا۔

***

گل ادب کا نیا شمارہ شائع ہو کر آ گیا تھا اور عبد القادر اس کی کاپیوں کو مستقل گاہکوں کو روانہ کرنے کے بندوبست میں لگا ہوا تھا۔ ایک میوزک کمپنی نے اس سہ ماہی رسالے کے اخراجات اٹھانے کی ذمہ داری لے رکھی تھی۔ کمپنی کا مالک مشروب علمی جانتا تھا کہ اس کی سو کاپیاں مہاراشٹر اکادمی اور سو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو روانہ کر دی جائیں گی۔ رسالے کے سو مستقل گاہک تھے۔ ان تمام کاپیوں کا حساب کرنے کے بعد ہی اس نے ہر تین ماہ پر ساڑھے تین، چار سو کاپیوں پر آنے والے خرچ کو اپنی جیب سے دینا منظور کیا تھا اور اس کے بدلے میں رسالے پر بطور پروپرائٹر اس کا نام بھی جلی حروف میں شائع ہوتا تھا۔ مشروب علمی اور عبد القادر دونوں ہی غیر عملی لیکن فکری طور پر گوڑھے مذہبی لوگ تھے۔ مشروب علمی کو ادب سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا، وہ تو یہ کام نیا نگر کے شعری و ادبی حلقے میں دھاک بٹھانے کی غرض سے کیا کرتا تھا۔ عبد القادر کو اس بات کا اطمینان تھا کہ اس نے محنت سے سو، سوا سو مستقل گاہک ایک ادبی اردو رسالے کے پیدا کر لیے تھے۔ ہندی، مراٹھی، گجراتی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں دیکھنے پر یہ گاہک چاہے کچھ بھی معلوم نہ ہوتے ہوں مگر اردو کی چھوٹی سی ادبی دنیا میں اسے ایک بڑی کامیابی ہی کہا جا سکتا تھا۔ اس کے پاس متواتر اپنے مستقل گاہکوں کے خطوط بھی آتے رہتے اور ان میں پچھلے شمارے کی تعریف کے ساتھ اگلے شمارے کے بے صبری سے کیے جانے والے انتظار کی بھی جھلک ہوتی تھی۔ حالانکہ 'گل ادب' ابھی تک اپنے مستقل گاہکوں، قومی اور ریاستی اداروں کی امداد کے باوجود

اتنی استطاعت نہیں پیدا کر سکا تھا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاتا اور اس کو مشروب علمی کی کوئی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ در اصل رسالے کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اس کی ترسیل بھی ایک بڑا مسئلہ تھی اور اس پر آنے والا خرچ اور خود رسالے کے ایڈیٹر عبد القادر کی ماہانہ تنخواہ نکالنے کے بعد مشروب علمی کے پاس پانچ دس ہزار کی رقم ہی پہنچ پاتی تھی۔ یہ حساب چاہے کتنا ہی مایوس کرنے والا کیوں نہ ہو مگر جب ایڈیٹر گل ادب نئے شمارے کی دو تین کاپیاں بغل میں دبائے نیا نگر کی گلیوں میں ایک آن سے نکلتا تو دو چار نظریں تو اس کی خوش خرامی اور ادب نوازی پر قربان ہو ہی اٹھتیں۔ ابتدائی ایک دو شماروں پر کچھ لوگوں کو اعتراض ہوتا تھا کہ رسالے میں پرانی شائع شدہ تخلیقات و تحاریر شائع ہوئی ہیں مگر اس کا حل عبد القادر نے دوسری طرح نکالا تھا۔ عبد القادر نے اردو کے ایک بہت بڑے ادیب جو کہ محقق، ناقد، لغت نویس، شاعر، فکشن نگار اور عالمی سے لر کر اردو ادب تک کے نبض شناس بھی تھے، کی سرپرستی کسی طرح حاصل کی۔ اس کے لیے پہلے انہیں مستقل دس بارہ تعریفی خطوط بھیجنے پڑے۔ پھر کسی رسالے میں ان کی ہلکی سی بھی توہین پر چراغ پا ہو کر اپنی جانب سے جوابی مضمون لکھ کر بھیجنے کا سلسلہ بھی اسی نے شروع کیا۔ اس کے جوابی مضامین میں زیادہ تر مضمون لکھنے والوں کی ذاتی زندگی پر کیچڑ اچھالا جاتا۔ انہیں لچر، بے وقوف، جاہل اور نہ جانے کون کون سے خطابات سے نوازا جاتا۔ اچھی بات یہ تھی کہ یہ محنت اکارت نہیں گئی اور بہت جلد ان ناقد و محقق صاحب کی طرف سے عبد القادر کو ایک خط موصول ہوا، جس میں اس کی ادب شناسی کی ہلکی سی تعریف کے ساتھ اسے کئی طرح کی نصیحتیں بھی کی گئی تھیں، اس کے یہاں موجود املا و گرامر کی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی تھی اور اپنی طرف سے یہ عندیہ جتایا گیا تھا کہ اس کے رسالے کو ایک ایسے سرپرست کی ضرورت ہے جو کہ اس کی رسائی کچھ غیر مطبوعہ تخلیقات تک بھی کروا سکے اور اس کی ذمہ داری بخوشی وہ محقق و ناقد اٹھانے کے لیے تیار ہیں، جہاں اردو کے بائیس رسالے ان کی سرپرستی میں نکل رہے ہیں، ایک اور سہی۔ عبد القادر کو اپنی خوش قسمتی پر اس دن یقین نہیں آ رہا تھا، اس نے بھاگ کر وہ خط مشروب علمی کو دکھایا۔ مشروب علمی لاکھ ادب سے بے بہرہ سہی مگر خود ایڈیٹر کی زبانی ان ناقد و محقق صاحب کی تعریف وہ جس انداز میں پہلے کئی بار سن چکا تھا اس سے اسے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ یہ شخص ادب کی کوئی بڑی کینن ہے اور گل ادب کو اس کی سرپرستی حاصل کروا دینا عبد القادر کا کینن شوٹ۔ ایڈیٹر گل ادب کی ذاتی زندگی بظاہر صاف ستھری دکھائی دیتی تھی مگر وہ حالات کا مارا ہوا ایک ایسا شخص تھا، جو عام زندگی میں بھی بات بات پر چڑ جاتا تھا۔ اس نے کبھی خود تو اپنے حالات زندگی پر بہت تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی مگر لوگ بتاتے ہیں کہ بیچ شادی شدہ جیون میں جب اس کی دو میں سے ایک بیٹی پوری طرح سیانی ہو چکی تھی، بیوی اسے کسی بات پر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اس کی وجہ لوگوں پر روشن نہیں تھی، طرح طرح کے الزامات تھے، قیاس تھے جو عبد القادر کو محض اس وجہ سے جھیلنے پڑے کیونکہ اس کی بیوی اس سے ایک غیر معلوم اور پر اسرار جھگڑے کی بنیاد پر علیحدہ ہو گئی تھی۔ کوئی اسے لونڈے باز کہتا، کوئی کہتا کہ نامرد ہے۔ مگر اصلی وجہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھی۔ اس کی دو بھیڑیوں جیسی آنکھوں میں سے بائیں طرف کی آنکھ پتھر کی تھی اور اس پر سفید جھلی، قریب قریب بند پلکوں کی جھری سے جس طرح جھانکتی تھی، بڑی بھیانک معلوم ہوتی تھی۔ اس کی ایک بیٹی ابھی چھوٹی تھی اور اپنی ماں کے ساتھ ہی رہتی تھی، جبکہ دوسری بیٹی نیا نگر میں ہی موجود تھی، جس کے ساتھ عبد القادر رہا کرتا تھا، بیٹی کے شوہر اور بچوں کے ساتھ اس کے تعلقات کافی بہتر تھے اور وہ ایک اچھا شوہر رہا ہو یا نہ رہا ہو، مگر ایک اچھا باپ اور نانا بننے میں ضرور کامیاب ہوا تھا۔ رسالہ نکالنے سے بہت پہلے سنا ہے کہ وہ ریلوے کے کسی وبھاگ میں ایک چھوٹی موٹی پوسٹ پر تھا مگر وہ نوکری شاید اس کی ذاتی زندگی کی پریشانیوں اور محرومیوں کے سبب دن بدن اس سے دور ہوتی گئی اور بالآخر ایک دن اس کی غائب دماغی کے چلتے اسے ہمیشہ کے لیے چھٹی پر بھیج دیا گیا۔ فارغ البالی اس کے مزاج کا حصہ نہیں تھی، چنانچہ اس نے کچھ روز بعد طرح طرح کے دھندے اپنانے شروع کیے، جن میں سے ایک سکرپٹ رائٹر اور سٹوری نریٹر کا بھی تھا۔ کہنے والے کہتے ہیں اور ماننے والے مانتے ہیں کہ دو تین سکرپٹ رائٹروں سمیت سنیما گھروں میں تین دن چلنے والی بالی ووڈ کی دو ایک حد درجہ پٹی ہوئی فلموں میں اس کا نام بھی پردے پر دیکھا گیا تھا۔ حالانکہ یہ بات اور ہے کہ اس کی شہادت کے لیے عبد القادر کے پاس لے دے کر ایک ہی جگری یار تھا، جو نیا نگر میں چائے کا ہوٹل چلاتا تھا اور جہاں اکثر ایڈیٹر کی ادبی و علمی بیٹھکیں ہوا کرتی تھیں، حالانکہ ادھر چند روز سے اس نے مجید صاحب کی لائبریری کا رخ کر لیا تھا۔ وہاں دن بھر وہ بیٹھتا اور مجید صاحب کی موجودگی میں بھی اپنے ادبی کارناموں اور معرکوں کا بیان بڑے دلچسپ پیرایے میں دانت پیس پیس کر اور الفاظ چبا چبا کر کیا کرتا۔ ایڈیٹر کسی کو کچھ بھی نہیں سمجھتا تھا، مجید صاحب کو تھوڑی بہت عزت دے دیا کرتا مگر وہ بھی احسان کی طرح، جسے وہ بسر و چشم قبول بھی کر لیتے۔ اس کے آگے بولنے کی مجال پہلے بھی لوگوں میں کہاں تھی جو کہ اب اس کا رسالہ نکلنے کے بعد اور ڈوب گئی تھی۔ طائر امروہوی، امانت مرزا اور قاری مستقیم تو دور کی بات رہے وہ نظیر روحانی کو بھی کسی خاطر میں نہیں لاتا تھا اور اکثر اس کا مذاق 'تاریخ نکالنے والا شاعر' کہہ کر اڑایا کرتا تھا۔ ایڈیٹر کسی نشست میں شرکت نہیں کرتا تھا، سالانہ مشاعرے میں شرکت کی اسے خواہش تو تھی اور سچ پوچھیے تو ابتدا میں اس کی فہرست میں اپنا

نام شامل کروانے کے لیے اس نے کچھ تگڑمیں بھی کیں، مگر جب نام نہیں آیا تو اس نے جل کر مشاعرے کے خلاف ایک تگڑا اداریہ اپنے رسالے میں شائع کیا، جو پڑھا تو کم لوگوں نے، مگر اس کا شور خود اس نے اتنا مچایا کہ میرا روڈ کے سالانہ مشاعرے میں شرکت کے امکان کا دروازہ بھی اس پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ در اصل وہ زود رنج انسان تھا، اس کے دل و دماغ میں کوئی ایسا غم، کوئی ایسی حسرت پل رہی تھی، جسے وہ عام طور پر ظاہر نہیں کرتا تھا، مگر اسی بیماری نے اس کو حد درجہ کا جھگڑالو بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے دوست بہت کم تھے۔ جو آج دوست ہے، کل اسی سے کسی بات پر خفا ہو کر کسی اردو اخبار میں ایک خط گھسیٹ مارنا اور ایسی اول جلول باتیں کرنا کہ سامنے والے سے دوستی کے اعادے کا چھوٹا سا بھی راستہ کھلا نہ رہ جائے، اس کا وتیرہ تھا۔ سب سے پہلے وہ یوسف جمالی کے یہاں بیٹھا کرتا تھا، پورے ایک سال صبر سے انتظار کرنے کے باوجود جب اس کا نام مشاعرے میں نہیں آیا تو پہلے ان سے زبردست جھگڑا ہوا۔ پھر قاری مستقیم کے یہاں چند روز بیٹھک رہی۔ لیکن ایک روز کسی مسئلے پر بات بڑھ گئی اور وہ دکان یاران نکتہ داں بھی ایڈیٹر کا ٹھکانہ نہ رہی۔ وہ نشستوں میں جاتا نہیں تھا یا بلایا نہیں جاتا تھا اس پر بھی دو رائیں تھی۔ ایک دھڑا مانتا تھا کہ وہ پہلے پہل کچھ نشستوں میں بلایا گیا مگر غزل کے کسی بے بحر شعر پر ٹوکے جانے کے جواب میں بھڑک اٹھا۔ اس کا موقف تھا کہ وہ غزل کی شاعری کرتا ہی نہیں، چنانچہ اتنی دیر سے جس نثری نظم کو احباب غزل سمجھ کر سن رہے تھے، وہ اس نظم میں ردیف و قافیے کی تکرار پر پہلے تو حیران ہوئے پھر تنگ گئے کہ ایڈیٹر انہیں بے وقوف سمجھتا ہے۔ چنانچہ بات کالر پکڑائی تک پہنچ گئی۔ ایسا ہی ایک دوسری نشست میں ہوا جہاں اس نے کسی نئے نویلے ترنم سے غزل پڑھنے والے شاعر کوکسی معمولی سے غیر مذہبی مضمون پر ٹوک دیا۔ نہ صرف ٹوک دیا بلکہ وہ شاعر سے ضد کرنے لگا کہ وہ اپنے اس گستاخانہ لہجے کے لیے برسر محفل معافی مانگے اور مصرعے میں اس کی بتائی ہوئی ترمیم کرے۔ شاعر نے جب معافی نہیں مانگی تو اس نے شاعر کو الو کے پٹھے کے خطاب سے نواز دیا اور اس کے جواب میں شاعر نے کھولتی ہوئی چائے اس کے منہ پر دے ماری۔ ہف ہف کرتا ہوا وہ اچھل کر لڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ایڈیٹر کو اندازہ نہیں تھا کہ ادبی اختلاف جب جسمانی اختلاف بن کر کشتی کی شکل میں تبدیل ہو جائے تب کیا کیا جائے، چنانچہ جب تک وہ آستین چڑھاتا، اس نوجوان شاعر نے ایک زوردار لات ٹھیک اس کی ٹانگوں کے بیچ فوطوں کی ڈھیلی تھیلیوں پر جمادی۔ وہ اوئی آہ کہہ کر بل کھا گیا۔ اس کی ایک آنکھ ابل پڑی تھی، دوسری آنکھ جو عام حالات میں تقریباً بند ہی رہتی تھی، درد کی شدت سے تھوڑی اور کھل گئی تھی۔ حلق سے کچھ گھڑ گھڑاتی ہوئی چیخیں نکلیں اور وہ بے ہوشی کی کیفیت میں مغلظات بکتا ہوا زمین پر دھم سے گر گیا۔ نوجوان شاعر اس کے سینے پر بیٹھ ہی چکا تھا، مگر میزبان اور دیگر مہمانوں کی ٹیم نے مل کر بڑی مشکل سے اسے الگ کیا۔ اس دن تو ایڈیٹر کسی طرح سے بچ بچا کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ مگر دوبارہ پھر کبھی نہ اس نے نشستوں کا رخ کیا اور نہ ہی کسی نے اسے اپنے یہاں بلا کر اچھی خاصی پر تکلف محفل کو اکھاڑے میں بدل دینے کی جرات دکھائی۔

***

’اس حرامی کو میں نہیں چھوڑوں گا۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی میرے رسالے میں چوری کی غزل بھیجنے کی!‘ ایڈیٹر لائبریری میں بیٹھا ہوا غصے سے ابل رہا تھا۔ آس پاس چند اور لوگ بیٹھے تھے۔ نئے شمارے میں کسی نئے کشمیری شاعر کی ایک غزل شائع ہوئی تھی۔ مگر رسالہ جب شائع ہو کر آیا اور ایڈیٹر نے اس کی کاپیاں گاہکوں کو پوسٹ کرنے سے پہلے اپنے دوستوں یاروں میں تقسیم کیں تو مجید صاحب نے ورق گردانی کرتے ہوئے اس مسروقہ غزل کے بارے میں سوال کیا۔ مجید صاحب نے بتایا کہ یہ غزل تو اردو کی ایک مشہور شاعرہ کی ہے اور ان کے مجموعے میں شامل ہے۔ اگلے روز ثبوت کے طور پر انہوں نے لائبریری سے وہ کتاب ڈھونڈ کر ایڈیٹر کو دکھا بھی دی۔ مسئلہ یہ تھا کہ رسالے کا نیا شمارہ ابھی ابھی شائع ہو کر آیا تھا۔ بیس ایک کاپیاں ڈاک کے ذریعے بھیجی بھی جا چکی تھیں۔ ڈاک کی پہلی باقاعدہ لاٹ، جس میں اسی کاپیاں بندھی رکھی تھیں، بھیجے جانے کے لیے بالکل تیار تھی اور اگلے دن اسے پوسٹ آفس میں مقر رہ وقت پر پہنچایا جانا تھا۔ چونکہ اب کچھ ہو نہیں سکتا تھا اور اگلا شمارہ آنے میں ابھی پورے تین چار ماہ کا وقت تھا اس لیے ایڈیٹر اپنی کم علمی اور سبکی کے احساس سے پھنکا جا رہا تھا۔ مجید صاحب نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

’کوئی بات نہیں، اگلے شمارے میں اعتذار شائع کر دینا۔ ہو جاتا ہے ایسا۔‘

ایڈیٹر اپنی ایک آنکھ سے فرش کو گھورے جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے کہا۔ ’اب اتنی غزلیں اردو میں لکھی جاتی ہیں، کون سی غزل کس کی ہے، پتہ لگانا بھی تو مشکل کام ہے۔ یہ بھی تو نہیں کہ ہر شاعر کا اپنا اسلوب ہو۔ میں بہن چود یہ غزل وزل چھاپنا ہی اگلے شمارے سے بند کر دوں گا۔ سرپرست صاحب کی طرف سے اب الگ ڈانٹ سننی پڑے گی کہ یہ فیصلہ لینے سے پہلے میں نے ان سے پوچھا نہیں۔ اچھا اتفاق دیکھیے صاحب! میں نے صرف غزل کے معاملے میں ہی اپنی عقل چلائی، باقی سارے مضامین، افسانے، کلاسیکی ادب کا حصہ یہاں تک کے خطوط بھی انہیں دکھا کر ہی

شائع ہونے کے لیے دیے۔ میں نے سوچا کہ بھئی ایڈیٹر ہوں تو غزل تو دیکھ ہی لوں، آخر میری بھی کچھ ذمہ داری ہے۔۔۔ اف میری بے عقلی۔۔۔ نہیں دکھایا تھا ان کو نہ دکھاتا، آپ ہی سے پوچھ لیتا مجید صاحب۔۔۔ توبہ توبہ۔۔۔ گل ادب کے کسی شمارے میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔' جس پلاسٹک کی کرسی پر وہ بیٹھا تھا وہ اچانک دھسک گئی اور ایڈیٹر زمین پر آگرا۔ پتہ چلا کہ ایک پایا اکھڑ گیا ہے، چوتڑوں پر لگی دھول کو ہتھیلیوں کی مدد سے صاف کرتا ہوا وہ اٹھا اور اٹھ کر برابر رکھے لکڑی کے ایک سٹول پر بیٹھ گیا۔ مجید صاحب اور باقی کے دوست اسے دیکھ رہے تھے۔ نجیب بھی ایک کونے میں بیٹھا اس نئے شمارے میں غزلوں کے حصے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خوش تھا کیونکہ اسی شمارے میں اس کی دو غزلیں ایک ساتھ شائع ہوئی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب گل ادب کا شمارہ جہاں جہاں جائے گا، لوگ اس کے نام سے واقف ہوں گے۔ اس کی شہرت اب صرف نیا نگر کی گلیوں تک ہی نہیں رہے گی، بلکہ وہ پورے ملک میں پھیلے گی، اس کا منفرد انداز، الگ لب و لہجہ ضرور بہت سے لوگوں کو متوجہ کرے گا۔ اسے یہ سوچ کر برا بھی محسوس ہو رہا تھا کہ گل ادب کا اگلا شمارہ شائع ہونے میں ابھی کافی وقت ہے، وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ مشاہیر ادب کے گل ادب کو لکھے گئے خطوط میں کون کون کہاں کہاں اور کیسے کیسے اس کا ذکر کرتا ہے۔

'کیا احوال ہیں دوستو!' ناظم عباسی کی پھولی ہوئی سانس سے الجھی ہوئی آواز نے اس کا دھیان توڑا۔ وہ ابھی ابھی لائبریری میں آئے تھے، ان کے ہاتھ میں بھی گل ادب کا نیا شمارہ تھا۔ وہ آ کر مجید صاحب کے برابر لگی کرسی پر بیٹھ گئے، جہاں پہلے ایک مقامی شاعر بیٹھا تھا مگر ناظم عباسی کی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے اس نے اٹھ جانا مناسب خیال کیا۔ مجید صاحب نے انہیں پورا معاملہ سمجھایا۔ پہلے تو انہوں نے ایڈیٹر کی طرف دیکھا اور اس کے بعد سنبھل کر گویا ہوئے۔

'ہو جاتا ہے میرے خیال سے ایسا۔ اس میں ایسی کوئی بڑی بات نہیں۔ اگلا شمارہ آئے تو معافی نامہ شامل کر دینا اور اس شاعر کو بلیک لسٹ کر دو۔'

دوسری بار یہی مشورہ ملنے پر ایڈیٹر نے گہرا ہنکارا بھرا اور پیچھے موجود دیوار سے سر ٹکاتے ہوئے کہا۔

'اگلے شمارے سے کوئی غزل شائع ہی نہیں ہو گی۔'

'غزل پر تمہارا غصہ ٹھیک نہیں۔' ناظم عباسی نے غزل کا مقدمہ لڑتے ہوئے کہا۔ 'اب یہ الگ بات ہے کہ اس معاملے میں تمیز کرنا تھوڑا مشکل ضرور ہے، مگر صاحب اسلوب غزل گویوں کو پہچاننا نا ممکن کام بھی نہیں۔'

ایڈیٹر نے دانت چبوڑتے ہوئے کہا۔ 'صاحب اسلوب مائی فٹ۔۔۔ مجھے تو سالا کوئی فرق نظر نہیں آتا ان غزل گویوں میں۔ میر سے لے کر فدا تک سب ایک ہی جیسے لگتے ہیں مجھے۔ نہیں آپ ہی بتائیے، پچھلے دنوں میرے ایک فلمی دوست نے سوال کیا کہ بھائی یہ اچھی غزل اور بری غزل کی پہچان کیسے ہوتی ہے؟ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا، میں نے کہا ردیف اور قافیے سے۔ پھر تھوڑی دیر بعد اپنے ہی جواب سے مجھے الجھن ہونے لگی۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ کوئی شاعر کیا ایسا ہے؟ جس کے یہاں اچھے شعر نہ ہوں؟ یا کوئی ایسا غزل گو ہے، جس نے کبھی برا شعر نہ کہا ہو۔ ایک اسلوب؟ کہاں سے بنے گا اسلوب جب مضامین آپ کے ہاتھ میں نہیں ہیں، وہ تو قافیے اور ردیف مل کر طے کرتے ہیں، پھر بحر کا بھوت الگ سر پر سوار رہتا ہے۔ اسلوب تو تب وضع ہو جب یہ سب پچھڑے نہ ہوں۔ مجھے تو اکثر اوقات میر، فراق اور ناصر کے اشعار ایک ہی جیسے لگتے ہیں۔ یہ اکلوتی صنف ہے جو روایت سے آگے کا سفر نہیں کرتی بلکہ پیچھے کی طرف بھاگتی ہے۔'

'یہ تو تم زیادتی کر رہے ہو عبد القادر!' ناظم عباسی نے بیڑی سلگاتے ہوئے کہا۔

'دیکھو! ادھر ادھر کی تو تم جانو۔۔۔ کیا میری غزل میں بھی تمہیں اسلوب کی سطح میں کوئی تجربہ نظر نہیں آتا؟'

ایڈیٹر بھنایا ہوا بیٹھا تھا یا پتہ نہیں اسے موقع کی تلاش تھی، اس نے بغیر کسی مروت کے کہا۔ 'تم نے کیا کیا ہے؟ ضرب الامثال اور محاوروں کو نظم کر لینا کوئی شاعری ہوتی ہے؟ اگر یہ شاعری ہوتی ہے تو مجھے کہنے دو کہ فلمی شاعر یہ کام بہت پہلے سے کر رہے ہیں۔۔۔ ذہن پر زور ڈالوں تو ایک دو مثالیں تو ابھی مل جائیں گی۔'

اس نے تھوڑا توقف کیا اور اس دوران اس کے ماتھے کی شکنیں مزید گمبھیر ہو گئی تھیں۔

'ہاں یہ دیکھو۔۔۔ وہ کیا گانا ہے۔۔ پانسے سبھی الٹ گئے دشمن کی چال کے، اکشر سبھی پلٹ گئے بھارت کے بھال کے۔۔۔ پھر وہ گانا ہے۔۔۔ میری آنکھ پھڑکتی ہے۔۔۔ دائیں یا بائیں؟ تیرا ساجن آنے والا ہے۔۔۔ تو محاورہ نظم کر لینا شاعری نہیں ہے۔۔۔ اب یہ بھی دیکھو کہ جدید غزل۔۔۔ وہ بھی اوٹ پٹانگ ہے۔۔۔ بلکہ پتہ نہیں مرغی یا بلی کی ٹانگ ہے۔۔۔ یہ جو آج کل کے شاعر لکھ رہے ہیں تجربے کے نام پر، اسے تو مجروح نے بہت پہلے لکھ دیا تھا، سی اے ٹی، کیٹ، کیٹ یعنی بلی، آر اے ٹی۔۔۔ ریٹ۔۔۔ ریٹ یعنی چوہا، دل ہے تیرے پنجے میں تو کیا ہوا۔۔۔ میری تو سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ کیسے کوئی فرق کرے اس غزل گوئی اور فلمی شاعری میں۔' اس کی سانسیں یہ سب کہتے ہوئے پھولنے لگیں۔

اچانک ایک قرابت داری کے احساس کا لمحہ شاید اس پر غالب آ گیا تھا، جس نے اس کی زبان روک لی۔ ناظم عباسی اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ مجید صاحب زیر لب مسکرا رہے تھے۔ پھر انہوں نے ایک ادا کے ساتھ اپنی بات یوں شروع کی۔

'یہ بات بہت حد تک ٹھیک لگ سکتی ہے کہ غزل کی زیادہ تر شاعری میں فرق کر پانا مشکل ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل

اوریجنل صنف نہیں ہے، ایک ترجمہ شدہ صنف سمجھ لیجیے اسے، تبھی تو آپ دکن کی شاعری کا مطالعہ کریں یا شمالی ہند کا، آپ کو فارسی شاعری کے اثرات ہی نہیں پورے پورے ترجمے مل جائیں گے۔ اور ان ترجمہ کرنے والوں میں قلی قطب شاہ بھی ہیں اور غالب بھی۔ بھئی ولی دکنی کو سعد اللہ گلشن نے یہی تو مشورہ دیا تھا کہ فارسی مضامین بیکار پڑے ہیں، انہیں استعمال کرو۔۔۔' سب لوگ ان کی باتیں غور سے سن رہے تھے۔

'مگر یہ ضرور ظلم ہو گا اگر ہم کہیں کہ اچھی اور بری غزل یا شعر میں فرق نہیں کیا جا سکتا۔ اچھا شعر تو میاں سنتے ہی پتہ چلتا ہے، بس فرق اتنا ہے کہ ہم غزل کی روایت، زبان، بیان، کیفیت، نکتہ آفرینی اور تغزل کی تعریفوں سے ٹھیک ٹھیک واقف ہوں۔ کبھی کبھی تو غزل کے ایک شعر کے مقابلے میں پورا پورا ناول ہیچ معلوم ہوتا ہے۔۔۔ وہ جو غالب نے کہا تھا، ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا۔ تو اس میں لاکھ تنافر کا عیب سہی، مگر کیا ایسا مصرع کوئی نو سکھیا یا فلمی شاعر کہہ سکتا ہے؟ ویسے تو فلمی شاعری کی اصلی مخالفت اس بنیاد پر نہیں ہے کہ وہ شاعری ہے یا نہیں۔ وہ تو اس بنیاد پر ہے کہ اس کے لیے شاعر کو اپنا قلم کوٹھے پر رکھنا پڑتا ہے۔ جیسا پروڈیوسر چاہے گا، ویسا لکھنا پڑے گا اور اچھی شاعری آن ڈیمانڈ نہیں ہو سکتی۔۔۔ کیا سمجھے میاں! اور یہ بات اب خود نئی نسل بھی سمجھ رہی ہے۔ میں کئی رسالوں میں دیکھتا ہوں کہ اب تو غیر مسلم لڑکے بھی بڑی اچھی اچھی غزلیں لکھ رہے ہیں۔'

'لیکن استاد! ان لڑکوں کی غزلیں ایک قسم کا فریب معلوم ہوتی ہیں۔' ایک شاگرد نے نکتہ اٹھایا۔

مجید صاحب نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا تو اس نے وضاحت کی۔

'میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سبھی ایسے ہیں مگر غیر مسلم لڑکے جس تیزی سے شعر کہہ رہے ہیں کیا آپ کو نہیں لگتا کہ اردو رسم الخط کو ختم کرنے کی سازش بھی ہو سکتی ہے اس کے پیچھے۔۔۔'

مجید صاحب نے غصے سے منہ پھیر کر کہا۔ 'کیا بے ہودہ بات ہے۔'

مگر ایڈیٹر نے ان کے شاگرد کی پچھ لیتے ہوئے کہا۔ 'سازش کی بات سے تو مجھے پوری طرح اتفاق نہیں ہے البتہ یہ بات ضرور کوفت پیدا کرتی ہے کہ کوئی دیوناگری میں غزل لکھ کر اسے اردو کی غزل کہلوانے پر اصرار کرے۔ ابھی پچھلے مہینے ہی میں نے دو غزلیں اس نوٹ کے ساتھ واپس کر دیں کہ یہ کوئی ہندی رسالہ نہیں ہے، مہربانی فرما کر اردو میں غزلیں بھیجیں، میں اردو کا مدیر ہوں، مجھے کوئی دوسری زبان نہیں آتی۔ اچھا سوچیے تو اتنی جرات آتی کہاں سے ہے۔ اب تو میں سنتا ہوں کہ میرا روڈ کے مشاعرے میں بھی لوگ دیوناگری میں غزلیں لکھ کر لاتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں اور سامعین اسے اردو غزل کہہ کر داد سے نوازتے ہیں۔'

'یہ بات مانی جا سکتی ہے کہ اردو شاعری کرنے والوں کو اردو زبان اور رسم الخط تو سیکھنا ہی چاہیے۔ میں نے چند ایک غیر مسلم شاگردوں کو پہلے اردو پڑھنے کی ہی ہدایت کی تھی، پھر وہ لوٹ کر نہیں آئے۔' مجید صاحب نے گہرے فکر مند لہجے میں کہا۔ 'محنت سے جی چراتے ہیں اور کیا۔ بس پھری پھری مل جائے، کچھ کرنا نہ پڑے۔'

اسی شاگرد نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔

ایک دوسرا شاگرد جو اکثر مشاعروں کی نظامت بھی کرتا تھا کہنے لگا۔ 'راتوں رات اتنے غیر مسلم شاعروں کا پردے پر ابھر آنا مشکوک تو کرتا ہی ہے پھر سوال یہ بھی ہے کہ یہ لوگ نہ اردو رسم الخط جانیں، نہ اپنے شعروں کی تقطیع ہی کرنا جانیں، تو پھر اتنی ساری غزلیں یہ کہتے کیسے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ ان سب کا مشترکہ استاد کوئی ایک ہی ہے، جو خاموشی سے انہیں لکھ کر دیتا رہتا ہے اور کیا پتہ بدلے میں کچھ لیتا لواتا بھی ہو یا پھر اس کی نیت کچھ اور ہو، واللہ اعلم بالصواب۔ اور پھر اس میں اردو والوں کا حق بھی مارا جاتا ہے۔'

ناظم عباسی نے گمبھیر لہجے میں اس معاملے میں اپنا نظریہ پیش کیا، اس طرح گویا وہ ایڈیٹر سے اپنی بے عزتی کا بدلہ بھی چکا دینا چاہتا ہو۔

'مگر صاحب! زمانہ بھی تو بدل رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کل کو دیوناگری میں ہی ادبی رسالے شائع ہوا کریں۔'

کسی نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ ہر طرف خاموشی تھی، چند سامعین جو بیٹھے تھے، اس امید میں تھے کہ کوئی کچھ بولے، نجیب اس بحث سے اکتا کر گل ادب میں شائع ایک شاعر کی خودنوشت کا باب پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ ناظم عباسی اپنی بے عزتی کو دھوئیں کے کشوں میں اڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شام کے چھ بجنے آئے تھے، کسی بائیک کے باہر رکنے کی آواز آئی۔ یہ وسیم کی بائیک تھی۔ اس نے لائبریری میں داخل ہوتے ہی سبھی لوگوں کو دھیمے سے سلام کیا اور پھر میز کے سامنے بیٹھے ایک لڑکے سے پوچھا۔ 'کتنی کتابیں نکلیں؟' جواب میں لڑکے نے انگوٹھے کے اشارے سے ایک بھی کتاب کے ایشو نہ ہونے کی اطلاع دی۔ لائبریری کھلے دو ماہ ہو چکے تھے۔ اور اس پورے عرصے میں مشکل سے چار پانچ کتابیں ہی ایشو کرائی گئی تھیں، اور ان میں سے بھی دو مقر رہ میعاد سے زیادہ عرصہ گزر جانے پر بھی واپس نہیں آئی تھیں۔ وسیم کسی سے کچھ بولے بغیر باہر نکلا، اس نے بائیک سٹارٹ کی اور لائبریری میں بیٹھے لوگوں کی نظروں سے پل بھر میں اوجھل ہو

گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایڈیٹر بھی اسٹول سے اٹھ کر بغیر کچھ کہے دکان سے باہر نکل گیا۔

* * *

تدوین اور ای بک کی تشکیل: اعجاز عبید